ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

- تزکیہ- قرآن کی ایک اصطلاح
  سید جلال الدین عمری
- تفسیر میں نظمِ قرآن کی استدلالی حیثیت
  حافظ مبشر حسین لاہوری
- صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کا مطالعہ- امنِ عالم کے نقطۂ نظر سے
  ڈاکٹر لطف الرحمٰن فاروقی
- شیخ شرف الدین یحییٰ منیری- حیات اور خدمات
  مولانا محمد شمیم اختر قاسمی
- معاصر حکام کے بارے میں امام مالکؒ کا معتدل نقطۂ نظر
  ڈاکٹر توفیق بن احمد الغلیز وری/ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی
- تبصرے

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ- ۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ——— ستمبر ۲۰۰۷ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ- ۲۰۲۰۰۱

Email: tahqeeqat_islami@yahoo.com, tahqeeqateislami@gmail.com

سہ ماہی **تحقیقاتِ اسلامی** علی گڑھ

جلد: ۲۶ شمارہ: ۳

جمادی الاخریٰ ——— رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ

جولائی ——— ستمبر ۲۰۰۷ء

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۲۵ روپیے
سالانہ	۱۰۰ روپیے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۲۵ روپیے

بیرونِ ملک

سالانہ (انفرادی)	۴۰۰ روپیے
سالانہ (ادارے)	۶۰۰ روپیے

پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰۰ روپیے
سالانہ (ادارے)	۳۰۰ روپیے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپواکر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

تزکیہ-قرآن کی ایک اصطلاح — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

تفسیر میں نظمِ قرآن کی استدلالی حیثیت — حافظ مبشر حسین لاہوری — ۱۵

بحث ونظر

صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کا مطالعہ-امنِ عالم کے نقطۂ نظر سے — ڈاکٹر لطف الرحمٰن فاروقی — ۴۷

سیر وسوانح

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری-حیات و خدمات کا ایک جائزہ — مولانا محمد شمیم اختر قاسمی — ۷۱

ترجمہ وتلخیص

معاصر حکام کے بارے میں امام مالک کا معتدل موقف — ڈاکٹر توفیق بن احمد الغلبزوری — ۹۱
مترجم: ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

تعارف وتبصرہ

ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۰۷
شاہ ولی اللہ کا رسالۂ سیرت — ،، — ۱۰۸
اصحابِ کہف کے غار کا انکشاف — جناب سراج احمد برکت اللہ فلاحی — ۱۰۹
خطباتِ جمعہ — ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی — ۱۱۲
مجلّہ 'الدین' — جناب مجاہد شبیر احمد فلاحی — ۱۱۴
کنکر بولتے ہیں (شعری مجموعہ) — جناب محمد شہاب الدین — ۱۱۵
خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی — ادارہ — ۱۱۷

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ حافظ مبشر حسین لاہوری
ناظم مبشر اکیڈمی لاہور، لیکچرر پریسٹن یونیورسٹی، لاہور کیمپس

۲۔ ڈاکٹر لطف الرحمٰن فاروقی
اسسٹنٹ پروفیسر دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۳۔ مولانا محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات (سنّی) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۴۔ ڈاکٹر توفیق بن احمد الغلمز وری
پروفیسر جامعۃ القرویین، المغرب

۵۔ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی
الہدی، ۱۴۴-۱۴۵، سعید کالونی، بیرسیاروڈ، بھوپال

۶۔ محمد رضی الاسلام ندوی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۷۔ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
لیکچرر شعبہ اسلامیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

۸۔ جناب سراج احمد برکت اللہ فلاحی
اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۹۔ جناب محمد شہاب الدین
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۰۔ جناب مجاہد شبیر احمد فلاحی قاسمی
اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۱۱۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

تزکیہ-قرآن کی ایک اصطلاح

سید جلال الدین عمری

'تزکیہ' قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے یہ ایک اہم اور بنیادی مقصد ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ مجھے اور میرے بیٹے اسمٰعیل کو مسلم اور اپنا فرماں بردار بنائے رکھ اور ہماری ذریّت سے امت مسلمہ برپا فرما۔ آگے دعا کے الفاظ یہ ہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرہ:۱۲۹)

اے ہمارے رب، ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اُٹھا، جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔

یہ سورۂ بقرہ کی آیت ہے۔ اسی سورہ میں آگے چل کر فرمایا۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ. (البقرہ:۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا، جو تمھیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہارا تزکیہ کرتا ہے، تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول فرمائی اور جن مقاصد کے لیے دعا کی گئی تھی ان کی تکمیل کے لیے رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے یہ مقاصد سورۂ آل عمران (آیت:۱۶۴) اور سورۂ جمعہ (آیت:۲) میں بھی بیان ہوئے ہیں۔

معنیٰ ومفہوم

'تزکیہ' کا مادہ (اصل) زکیٰ ہے ۔ اس کے معنی ہیں بڑھنا، نشوونما پانا، خیروصلاح اورتقویٰ کا پایا جانا،عبادت اور پاکیزگی کا حاصل ہونا۔ اس میں خودستائی اور اپنی نیکی کے اظہار واعلان کے معنی بھی پائے جاتے ہیں ۔ان تمام ہی معنوں میں قرآن و حدیث میں اس کا استعمال ہوا ہے۔[۱]

اس پہلو سے تزکیہ یہ ہے کہ آدمی کی فکری وعملی کم زوریاں ، جو اسے پستی اور زوال کی طرف لے جاتی ہیں دورہوں اوراس کے اندر صحیح فکراوراخلاق وتقویٰ کی خوبیاں جلوہ گرہوں،جن سے اس کی شخصیت کا ارتقا ہوسکتا اور وہ اعلیٰ مدارج طے کرسکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا. وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا(الشّمس:۹-۱۰)

یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

یہاں تزکیہ کے بالمقابل 'تدسیہ' کا لفظ آیا ہے۔'تزکیہ' میں نشوونما پانے اور ابھرنے کا تصور ہے اس کے برخلاف 'تدسیہ' یہ ہے کہ کسی چیز کو ابھرنے نہ دیا جائے اور اسے دبا دیا جائے ۔زمخشری کہتے ہیں :

التزكية الإنماء والإعلاء بالتقوىٰ والتدسية النقص والإخفاء بالفجور[۲]

تزکیہ کے معنی ہیں تقویٰ کے ذریعہ شخصیت کو نمودینا اور بلند کرنا۔(اس کے برعکس) فسق وفجور کے ذریعہ شخصیت میں نقص پیدا کرنے اور اسے چھپادینے کا نام 'تدسیہ' ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا اپنی شخصیت کو نیکی اور تقوی کے ذریعہ اوپر اٹھانا 'تزکیہ' ہے۔'تدسیہ' یہ ہے کہ آدمی ضلالت وگم رہی اور اخلاقی پستی میں پڑا رہے اور اپنی شخصیت کو ابھرنے نہ دے۔

---

[۱] ابن منظور کہتے ہیں:اصل الزكاء فى اللغة الطهارة والنماء والبركة والمدح وكلة قد استعمل فى القرآن والحديث، لسان العرب: مادہ زکیٰ،۱۴/ ۳۵۸، دار صادر بیروت،۱۹۹۴ء

[۲] زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل: ۴/ ۷۴۸، دار الکتب العلمیۃ، لبنان،۱۹۹۵ء

تزکیہ کے ہم معنٰی الفاظ

تزکیہ کے معنی میں 'تطہیر' کا لفظ بھی آیا ہے، حضرت مریمؑ کے متعلق ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ (آل عمران:۴۲)

اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔

آیت میں لفظ 'طَھَّرَکِ' آیا ہے، اس کا مصدر 'تطہیر' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو تمام اخلاقی کم زوریوں سے پاک کیا اور ان کے اندر نیکی، تقویٰ اور عفت وعصمت جیسی خوبیاں پیدا فرمائیں۔ یہی تزکیہ ہے۔

ازواجِ مطہرات کے متعلق ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْراً. (الاحزاب:۳۳)

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کردے۔

آیت میں 'رجس' کا لفظ آیا ہے۔ اس کا استعمال گندگی، میل کچیل، قبیح حرکت، حرام اور کفر جیسی فکری وعملی خرابیوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد دینی اور اخلاقی کم زوریاں ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازواجِ مطہرات کو ہر قسم کی دینی اور اخلاقی کم زوریوں سے پوری طرح پاک کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے 'تطہیر' کا لفظ آیا ہے۔ تزکیہ اسی کا نام ہے۔

وضو اور تیمّم کے احکام کے ذیل میں ارشاد ہے۔

مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ. (المائدہ:۶)

اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، مگر وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردے۔ شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

وضو اور تیمّم کے ذریعہ آدمی کو جسمانی پاکی حاصل ہوتی ہے اور وہ نماز اور تلاوت جیسی عبادات کے ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ گناہوں سے بھی پاک ہوتا ہے۔ یہاں 'تطہیر' کے ذریعہ ان دونوں ہی باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہی تزکیہ ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ تطہیر اور تزکیہ کے الفاظ ایک ساتھ ہم معنی کے طور پر بھی آئے ہیں۔ (التوبۃ:۱۰۳)

تزکیہ کے لیے 'تربیت' کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔ تربیت کے معنی ہیں:

انشاء الشیئ حالاً فحالاً الی حد التمام. [۱] — کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح پہنچانا کہ وہ حد کمال کو پہنچ جائے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کو اسی معنی میں 'ربّ' کہا جاتا ہے کہ وہ جس مخلوق کی جس مرحلۂ حیات میں جو حاجت ہے وہ پوری کرتا اور اسے درجۂ کمال تک پہنچاتا ہے۔ تزکیہ کا عمل بھی اسی طرح انجام پاتا ہے۔ تربیت ہی سے مربّی کا لفظ نکلا ہے۔ مربی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ماتحت فرد یا افراد کی نگرانی کرتا اور اس میں جو کمزوری یا خرابی پائی جائے اس کی اصلاح کرتا ہے۔

'تزکیہ' خداپرستانہ زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اس لیے اسے تقویٰ بھی کہا گیا ہے۔ چناں چہ سورۃ اللّیل میں ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى، اَلَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكّٰى. (اللیل: ۱۷-۱۸) [۲] — اور اس (آگ) سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔

دین میں تزکیہ کی اہمیت اور اس کا مقام

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ذریت میں ایک پیغمبر کی بعثت کی جو دعا کی تھی، اس کے مقاصد میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کا ذکر

---

[۱] راغب اصفہانی، مفردات القرآن، مادہ رب، ص ۱۹۰

[۲] نیز ملاحظہ ہو، النجم: ۳۲

ہے۔ (البقرہ: ۱۲۹) یہ درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کی اصل غرض علمی اور عملی تزکیہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے نتیجہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا جہاں ذکر ہے وہاں تلاوت آیات کے فوراً بعد تزکیہ کا ذکر ہے (البقرہ: ۱۵۱) اس لیے کہ اصل غرض وغایت تزکیہ ہی ہے۔ تعلیم کتاب وحکمت اسی کے لیے ہے۔ قاضی بیضاوی کہتے ہیں: 'اصل مقصد تزکیہ ہے' اس لیے اسے یہاں مقدم رکھا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں اس کا ذکر آخر میں آیا ہے، اس لیے کہ یہ نتیجہ کے طور آخر ہی میں حاصل ہوتا ہے۔ [۱]

اس سے دو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ تزکیہ کی بنیاد، تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت پر ہونی چاہئے۔ اس کے بغیر حقیقی تزکیہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس راہ سے ہٹ کر کسی اور طریقہ سے جو تزکیہ ہو اس کا اسلام کے نزدیک کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ اگر تلاوت آیات ہو، کتاب اللہ کی تعلیم ہو اور اس کے اسرار و معارف اور حکمتوں کا بیان بھی ہو اور تزکیہ نہ ہو تو ان کی حقیقی غرض وغایت پوری نہ ہوگی۔ وہ ایک ایسی تگ و دو ہوگی جس میں نشانات راہ کو منزل سمجھ لیا جائے۔

تزکیہ کا وسیع تصور

تزکیہ، اس کے مادّے زکیٰ اور ان کے مشتقات کا استعمال قرآن مجید میں مختلف مواقع پر ہوا ہے۔ ان سب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ تزکیہ کا مطلب کسی ایک شعبۂ حیات کی اصلاح اور اس کا خامیوں سے پاک ہونا اور اس میں خوبیوں کا پایا جانا نہیں ہے، بلکہ پوری زندگی کا تزکیہ ہے۔ اگر عبادات کا تزکیہ ہوجائے اور گھر اور خاندان میں اس کے منافی رویّہ اختیار کیا جائے تو یہ ناقص تزکیہ ہوگا۔ اسی طرح آدمی کے اخلاق سنور جائیں اور اس کے معاملات میں فساد پایا جائے تو یہ بھی تزکیہ کی کمی ہوگی۔ قرآن کی تعلیمات کی رو سے تزکیہ ایک ہمہ جہت اور جامع عمل ہے اور انفرادی واجتماعی ہر پہلو سے اصلاح وتربیت کا نام ہے۔

---

[۱] بیضاوی کے الفاظ ہیں: قدّمہ باعتبار القصد واخّرہ فی دعوۃ ابراہیم علیہ السلام باعتبار الفعل۔ تفسیر بیضاوی، ۱/۹۵

عقیدہ کا تزکیہ

تزکیہ کا اولین مرحلہ عقیدے اور فکر کی اصلاح ہے۔ اللہ کے پیغمبر اسی سے تزکیہ کا آغاز کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں میں ایک سورۂ اعلیٰ بھی ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کو تذکیر اور نصیحت کا حکم دیا گیا اور کہا گیا کہ جس کسی کے اندر اس سے خوف اور خشیت پیدا ہوگی وہ فائدہ اٹھائے گا اور جو کوئی بدقسمت ہے وہ اس سے دور ہی رہے گا اور آتش جہنم کا مستحق ہوگا (الاعلیٰ: ۹-۱۳) اس کے بعد فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی (الاعلیٰ: ۱۴) فلاح پا گیا وہ جس نے تزکیہ اختیار کیا۔

مکہ کے ابتدائی دور میں تزکیہ کے اندر بنیادی طور پر یہ بات داخل تھی کہ آدمی شرک اور بت پرستی سے بالکلیہ دست بردار ہو جائے، توحید خالص کا عقیدہ اس کے دل و دماغ میں رچ بس جائے اور وہ معصیت کو چھوڑ کر اللہ کی اطاعت کی راہ اختیار کر لے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کے معنی بیان کرتے ہیں۔ تزکیٰ من الشرک۔ یعنی کامیاب ہوا وہ جس نے شرک سے پاکی اختیار کی۔

مفسر امام ابن جریر طبری نے اس آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

قد نجح و ادرک طلبته من تطهّر من الکفر و معاصی الله وعمل بما أمره الله به فأدّی فرائضه [1]

بے شک وہ کامیاب ہوا اور اپنی مراد کو پالیا جس نے کفر اور اللہ کی معصیتوں سے پاکی حاصل کی، اللہ نے جن امور کا حکم دیا ان پر عمل کیا اور اس کے بتائے فرائض ادا کیے۔

اس سلسلہ میں ایک روایت بھی حافظ ابوبکر بزّار نے نقل کی ہے۔ حضرت جابرؓ ابن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے 'قد افلح من تزکیٰ' کے ذیل میں ارشاد فرمایا:

من شهد ان لا الٰه الا الله وخلع الانداد وشهد انّی رسول الله [2]

جس نے شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جن چیزوں کو اس کا مد مقابل ٹھہرایا جاتا ہے ان سے علیحدگی اختیار کی اور اس بات کی گواہی دی کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن، جزء ۳۰، ص ۹۹، دار المعارف، بیروت لبنان، ۱۹۷۸ء

[2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۴/۵۰۱، قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: جلد ۱۰، جزء ۲۰، ص ۱۶

جلالین میں 'تزکیٰ' کی تشریح 'تطہّر بالایمان' سے کی گئی ہے[۱]۔ یعنی کامیاب وہ ہوا جس نے ایمان کے ذریعہ پاکی حاصل کی۔

قرطبی میں ہے:

ای من تطھّر من الشرک بایمان [۲] یعنی وہ جو ایمان کے ذریعہ شرک سے پاک ہوا۔

مکہ کے ابتدائی دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں سورہ الشّمس بھی ہے۔ اس میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا. وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا. (الشّمس: ۹-۱۰) یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

مطلب یہ کہ وہ شخص فلاح یاب اور کامیاب ہوا جس نے نیکی اور تقویٰ کے ذریعہ اپنی شخصیت کو ترقی دی اور اعلیٰ مدارج تک رسائی حاصل کی۔ اس کے برعکس ناکام اور نامراد ہوا وہ جس نے غلط عقیدہ وفکر اور بداعمالیوں سے اپنی ذات کو ابھرنے نہ دیا اور اسے تہہ خاک کر کے رکھ دیا۔ علامہ شوکانی کہتے ہیں۔

من زکّیٰ نفسه وأنما ها وأعلاها بالتقویٰ فاز بکل مطلوب وظفر بکل محبوب..... وخسر من أضلّها وأغواها وأخملها ولم یشهر ها بالطاعة والعمل الصالح. [۳]

جس نے تقویٰ کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ کیا، اسے نشوونما دیا اور اوپر اٹھایا اس نے ہر مطلوب پالیا اور کامیاب رہا..... لیکن وہ شخص خسارے میں رہا جس نے اسے گم راہ کیا اور بھٹکایا، اسے بجھایا اور اللہ کی اطاعت اور عمل صالح کے ذریعہ اسے ابھرنے اور نمایاں ہونے نہ دیا۔

یہ مکی سورتوں کی بعض آیات ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر مکّی سورتوں میں بھی مختلف مناسبتوں سے تزکیہ کا ذکر ہے۔ ان میں عقیدہ اور فکر کے تزکیہ کا پہلو نمایاں ہے۔ مدنی سورتوں میں بھی تزکیہ کی ہدایات موجود ہیں۔ ان میں سے بعض میں عقیدہ اور فکر کی اصلاح کا صاف ذکر پایا جاتا ہے۔ سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

---

۱ تفسیر جلالین، تفسیر سورۃ الاعلیٰ

۲ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۱۰، جزء ۲۰، ص ۱۶

۳ محمد سلیمان عبداللہ الاشقر، زبدۃ التفسیر من فتح القدیر (للشوکانی) ص ۸۰۹، کویت ۱۹۸۵ء

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ. (الجمعہ:۲)

وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اُٹھایا، جو انھیں اُس کی آیات سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے ان عظیم احسانات کا ذکر ہے جو اس نے اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ ایک 'امّی' قوم پر کئے۔ یہ احسانات وقتی نہیں دائمی تھے۔ 'امّی' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ امام راغب کہتے ہیں:

الامّی هو الذی لایکتب ولایقرأ من کتاب

امّی وہ ہے جو نہ لکھ سکے اور نہ کوئی کتاب پڑھ سکے۔

اس میں غفلت اور جہالت کا تصور بھی ہے۔[۱]

'امّی' یہاں اہلِ عرب کو کہا گیا ہے۔ ان کی دورِ جاہلیت کی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ وہ 'ضلال مبین' (کھلی ضلالت) میں مبتلا تھے۔ اس سے اصلاً مراد شرک اور دینِ حق سے بے خبری اور فسق و فجور کی زندگی ہے۔ عقیدے اور عمل کی اس ضلالت سے نکالنا 'تزکیہ' ہے۔ زمخشری نے 'وَیُزَكِّیْهِمْ' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

یطهّرهم من الشرک وخبائث الجاهلیة[۲]

آپ انہیں شرک سے اور جاہلیت کی خباثتوں سے پاک کرتے ہیں۔

قاضی شوکانی کہتے ہیں:

یزکّیهم ای یطهّرهم من دنس الکفر والذنوب وسیئ الأخلاق وقیل یجعلهم أذکیاء القلوب بالإیمان. [۳]

آپ ان کا تزکیہ کرتے ہیں، یعنی انہیں کفر اور گناہوں کے میل کچیل اور برے اخلاق سے پاک کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی بھی بیان ہوئے ہیں کہ آپ ان کو ایمان کے ذریعہ ذکی القلب (پاک دل) بناتے ہیں۔

---

۱ راغب اصفہانی، مفردات القرآن، مادہ 'امّ' ص ۳۳، دار المعرفۃ، بیروت ۱۹۹۸ء
۲ زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل: ۴/۵۱۷
۳ زبدۃ التفسیر من فتح القدیر، ص ۷۴۰

سورۂ آل عمران میں یہی بات اہل ایمان پر اللہ کے احسان کی حیثیت سے بیان ہوئی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيٰتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُواْ مِن قَبْلُ لَفِيْ ضَلالٍ مُّبِيْنٍ. (ال عمران:۱۶۴)

درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے، اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

یعنی اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ انہیں اس صریح ضلالت سے نکالا جس میں وہ پڑے ہوئے تھے۔ یہ ضلالت فکر وعقیدہ اور اخلاق وکردار ہر طرح کی تھی۔ تزکیہ اسی سے نکالنے کا نام ہے۔ زمخشری نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

ویطهرهم من دنس القلوب بالكفر ونجاسة سائر الجوارح بملابسة المحرمات و سائر الخبائث[۱]

کفر کی وجہ سے دلوں میں جو گندگی پیدا ہوجاتی ہے اس سے آپ انہیں پاک کرتے ہیں۔ (اسی طرح) محرمات اور خباثتوں میں آلودہ ہونے کی وجہ سے اعضاء وجوارح کو جو نجاست لاحق ہوجاتی ہے اسے دور فرماتے ہیں۔

یہی بات قاضی بیضاوی نے مختصر الفاظ میں کہی ہے:

يطهّر هم من دنس الطباع وسوء الاعتقاد والاعمال[۲]

آپ انہیں طبیعتوں کی گندگی اور بداعتقادی اور بدعملی سے پاک کرتے ہیں۔

عبادات کا تزکیہ

تزکیہ عبادات کا بھی ہوتا ہے اور عبادات سے تزکیہ حاصل بھی ہوتا ہے۔ سورۂ

---

۱ زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل: ۱/ ۴۲۷

۲ بیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل: ۱/۱۸۸، دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۸۸ء

اعلیٰ میں ارشاد ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی (الاعلیٰ:۱۴-۱۵) فلاح پا گیا وہ جس نے تزکیہ اختیار کیا اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی۔

اس میں تزکیہ کو فلاح کا ذریعہ قرار دینے کے ساتھ اس کی ایک عملی شکل بھی بیان کردی گئی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اللہ کا ذکر کرے اور اس کا نام لیتا رہے۔ اس کی بہترین صورت وہ اوراد اور دعائیں ہیں جن کا رسول اللہ ﷺ شب و روز اور ہر موقع پر اہتمام فرماتے تھے اور جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ اللہ کا نام لینے اور اسے یاد کرنے کا سب سے اعلیٰ وارفع ذریعہ نماز ہے۔ اسی وجہ سے ذکرِ رب کے فوراً بعد نماز کا تذکرہ ہے۔ نماز کے بغیر تزکیہ کا تصور نہیں ہے۔ نماز میں سجدہ ہے اور سجدہ اللہ سے قربت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ حکم ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (العلق:۱۹) سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔

زکوٰۃ میں تزکیہ کا مفہوم موجود ہے، اس لیے کہ دونوں کا مادہ ایک ہے۔ زکوٰۃ سے مال پاک بھی ہوتا ہے اور اس میں خیر و برکت اور نشوونما بھی ہوتی ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ:۱۰۳) آپ ان کے اموال میں سے صدقہ قبول کرکے ان کی تطہیر اور تزکیہ فرمائیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ صدقات اگر صحیح ہاتھوں میں پہنچیں تو اس سے تطہیر اور تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔

روزے کا مقصد لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ:۱۸۳) یعنی تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو، کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اس سے امید کی جاسکتی ہے کہ آدمی گناہوں سے بچے گا اور خدا پرستی کی راہ اختیار کرے گا۔ تقویٰ ہی کا دوسرا نام تزکیہ ہے۔

(باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو راقم کی کتاب، 'انفاق فی سبیل اللہ' شائع شدہ از مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

تحقیق وتنقید

تفسیر میں نظمِ قرآن کی اِستدلالی حیثیت

[اصولِ تفسیر کی روشنی میں ایک جائزہ]

حافظ مبشر حسین لاہوری

قرآن مجید آخری الہامی کتاب ہے جو حالات ومواقع کی مناسبت سے متفرق اجزاء کی شکل میں کم وبیش تئیس (۲۳) سالوں میں آنحضرت پر نازل ہوئی اور آپ نے اس کی حفاظت کے پیش نظر اپنی حیات طیبہ میں ہی اسے غیر نزولی ترتیب کے ساتھ صدور وقرطاس میں محفوظ کروادیا۔ بعد میں صحابہ کرامؓ نے اسے مصحف کی شکل دے دی۔

قرآن مجید کا نزول تو متفرق اجزاء کی شکل میں ہوا، مگر آنحضرتؐ نے اس کی ترتیب کے لیے نزول کا اعتبار نہ کیا، بلکہ خدائی حکم کے تحت اسے وہ مخصوص شکل عطا کی جو آج ہمارے سامنے ہے، مگر یہ مخصوص ترتیب بھی عام روایتی کتابوں کی ترتیب کے برعکس ایک معجزانہ ترتیب پر مشتمل ہے۔ قرآن مجید کے متفرق اجزاء کی شکل میں نازل ہونے کی وجہ سے اہل علم میں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ قرآن مجید منتشر احکام اور متفرق بیانات (خطبات) کا مجموعہ ہے یا ایک مرتب ومنظّم اور مربوط کتاب ہے۔ عرب میں محمد عبدہ مصری، محمد رشید رضا، احمد مصطفیٰ مراغی، شیخ محمود شلتوت، امین الخولی، عائشہ عبدالرحمٰن اور برصغیر میں مولانا عبدالحمید فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ قریب قریب اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن مجید ایک ایسی منظّم ومربوط کتاب کی حیثیت رکھتا ہے جس کی ہر آیت دوسری آیت سے اور ہر سورت دوسری سورت سے ربط ونظم رکھتی ہے اور یہ ربط و نظم مجموعی طور پر اسے ایک منظّم کتاب کی شکل عطا کرتا ہے۔ بلکہ مولانا فراہی وصلاحی کے ہاں تو قرآن مجید کے بارے میں یہ فیصلہ بھی ملتا ہے کہ سورۂ فاتحہ اس آسمانی کتاب کا دیباچہ ومقدمہ، معوذتین اس کا خاتمہ اور ان کے درمیان موجود سورتیں بقول

مولانا اصلاحی اس کے سات گروپ (ابواب) اور بقول مولانا فراہی نو گروپ (ابواب) ہیں۔ پھر ہر گروپ میں شامل مختلف سورتوں میں سے ہر سورت عام طور پر ایک مستقل (یعنی فصل کی) حیثیت رکھتی ہے، مگر اس کا تعلق اپنے گروپ (باب) کے ساتھ موجود رہتا ہے۔[۱]

پھر مولانا فراہی و اصلاحی نے ہر گروپ میں موجود سورتوں کے مرکزی اور ذیلی مضمون بھی اس طرح متعین کیے ہیں جس طرح ایک کتاب کے ابواب و فصول کے متعین کیے جاتے ہیں، جب کہ متقدم و متأخر مفسرین میں سے جمہور کی رائے یہ نہیں ہے۔ عربوں میں سے امام شوکانی یمنیؒ نے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے، جب کہ برصغیر میں مولانا مودودیؒ نے بھی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ آپ نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے مقدمہ میں بہ تکرار اس موقف کی تردید کی ہے مثلاً لکھتے ہیں:

ا).....''عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے ابھی تک اجنبی رہا ہے پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ 'کتاب' ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا، پھر اصل مضمون کو ابواب اور فصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو بھی الگ الگ لے کر اس کے متعلق احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی، لیکن جب وہ کتاب کھول کر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اُسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرے ہی اندازِ بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثارِ کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف الفاظ میں دہرایا جارہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دوسرا

اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہوجاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکا یک آجاتا ہے۔.....'' ۲

۲).....''اسی لیے ایک عام کتاب خواں کی سی ذہنیت لے کر جب ہم میں سے کوئی شخص قرآن کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے موضوع ،مدّعا اور مرکزی مضمون کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کا اندازِ بیان اور طرزِ تعبیر بھی اسے کچھ اجنبی سا محسوس ہوتا ہے اور اکثر مقامات پر اس کی عبارات کا پس منظر بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔''۳

۳).....''یہ قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اسے لکھ کر محمد ﷺ کو دے دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ اسے شائع کر کے لوگوں کو ایک خاص رویۂ زندگی کی طرف بلائیں، نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں مصنفانہ انداز پر کتاب کے موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ تصنیفی ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ کتابی اسلوب۔''۴

آگے تفسیر میں بھی مختلف مواقع پر اس مخصوص نقطۂ نظر کی واضح نفی ملتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مولانا مودودی نظم ومناسبت کی کسی صورت کو بھی قبول نہیں کرتے ،بلکہ آپ آیات اور سورتوں کے ظاہری ربط کی حد تک فوائد کی حیثیت سے اپنی تفسیر میں اس طرف توجہ دیتے نظر آتے ہیں، مگر اس میں نہ تو خواہ مخواہ کے تکلّفات سے کام لیتے ہیں ،نہ نظمِ قرآن کو تفسیرِ قرآن کے لیے اصولی اور کلیدی اہمیت دیتے ہیں اور نہ سورتوں کی گروپ بندی، ، ہر گروپ اور ہر سورت کے ایک ہی مرکزی موضوع پر مشتمل ہونے کے فراہی فلسفہ کو آپ لائق اعتنا سمجھتے ہیں۔ جب کہ مولانا فراہی واصلاحی کے ہاں تو: ''ہر سورہ ایک مستقل وحدت ہے، اس کا ایک علیحدہ عنوان وموضوع (عمود) ہے اور اس سورہ کے تمام اجزائے کلام اس عنوان وموضوع سے نہایت گہری وابستگی رکھتے ہیں۔''۵

اس سے آگے مولانا اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

''جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہوتا ہے جس سے سورہ کے تمام اجزائے

کلام وابستہ ہوتے ہیں اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے اور اس گروپ کی تمام سورتیں اسی جامع عمود کے کسی خاص پہلو کی حامل ہیں۔ مطالب اگرچہ ہر گروپ میں مشترک سے ہیں، لیکن اس اشتراک کے ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہے۔''[۶]

مولانا مودودی سورتوں کی اس گروپ بندی اور ان کے مختلف مرکزی مضامین پر مشتمل ہونے کے برعکس یہ رائے رکھتے ہیں کہ ''اس (قرآن مجید) کا موضوع انسان ہے اس اعتبار سے کہ بلحاظِ حقیقتِ نفس الامری اس کی فلاح اور اس کا خسران کس چیز میں ہے۔ اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظامِ کائنات اور اپنی ہستی اور اپنی دنیوی زندگی کے متعلق جو نظریات قائم کیے ہیں اور ان نظریات کی بنا پر جو رویے اختیار کر لیے ہیں وہ سب حقیقتِ نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم 'صحیح رویہ' کے نام سے بیان کر چکے ہیں۔ اس کا مدّعا انسان کو اس صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔ ان تین بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع اور اپنے مدعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اول سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں..... یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اس حد تک اور اس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مدعا کے لیے ضروری ہے۔ ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدر ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ 'دعوت' کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔''[۷]

ماضی قریب کی ان مذکورہ عبقری شخصیات کے زیرِ نظر موضوع پر اختلاف کو آغاز ہی میں واضح کر دینے کا مقصد اس موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کرنا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم اس موضوع کی تعریف ،آغاز وارتقاء ،علوم قرآن واصول تفسیر میں اس کی استدلالی حیثیت وغیرہ پر ضروری تفصیلات مہیا کریں گے۔ اس موضوع کے لیے چوں کہ متقدمین و متأخرین نے بالعموم 'نظم' کی اصطلاح استعمال کی ہے،اس لیے ہم بھی اسے 'نظمِ قرآن' سے موسوم کریں گے۔

اصطلاحِ 'نظم قرآن' کا آغاز:

یہ معلوم نہیں کہ قرآن مجید کے نظم وربط کے سلسلہ میں سب سے پہلے کس صاحبِ علم نے گفتگو فرمائی، البتہ متقدمین میں سے جن اصحاب علم نے اس سلسلہ میں کلام کیا ہے، ان میں امام ابن قتیبہ (۲۱۳ھ۔۲۷۶ھ) ابو الحسن علی بن عیسیٰ رمانی معتزلی (۲۹۶ھ۔۳۸۳ھ) قاضی عبدالجبار اسد آبادی معتزلی (۳۵۹ھ۔۴۱۵ھ) امام خطابی (۳۱۹ھ۔۳۸۸ھ) ابن جعفر باقلانی اشعری (۳۳۸ھ۔۴۰۳ھ) عبدالقاہر جرجانی اشعری (۴۷۱ھم) کے نام سرفہرست ہیں۔ ابن قتیبہ نے **تاویل مشکل القرآن** میں، رمانی نے **النکت فی اعجاز القرآن** میں، قاضی عبدالجبار نے **المغنی فی ابواب التوحید والعدل** کی سولہویں جلد میں، خطابی نے **البیان فی اعجاز القرآن** میں، باقلانی نے **اعجاز القران** میں، جرجانی نے **دلائل الاعجاز** میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ان اصحاب نے نہ صرف یہ کہ اپنی تصنیفات میں نظمِ قرآن (نظمِ کلام) کی اصطلاح استعمال کی، بلکہ نظمِ کلام کو قرآن مجید کے اعجاز کا محل بھی قرار دیا۔ لیکن ان کے ہاں نظمِ کلام سے مراد وہ مفہوم نہیں تھا جسے متأخرین میں مولانا فراہی و اصلاحی نے متعارف کروایا ہے، بلکہ ان کے ہاں نظمِ قرآن سے مراد یہ تھا کہ قرآن مجید کے محض الفاظ وکلمات ہی معجزانہ حیثیت نہیں رکھتے اور نہ فقط ان کے معانی کا یہ حال ہے، کیونکہ یہی الفاظ ومعانی تو عربوں کے ہاں بھی مروج تھے، البتہ ان الفاظ ومعانی کی ترکیب سے جو کلام ،قرآنی آیات اور قرآنی جملوں کی شکل میں پیش ہوتا تھا ،وہ معجزہ

تھا اور اس جیسی ترکیب پر مبنی ایک سورت بھی پیش کرنے سے کفار عاجز آ گئے تھے۔ امام خطابیؒ اسی پس منظر میں فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کے معجزہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا نظم عمدہ، الفاظ فصیح اور معانی حسین ہیں۔ اس نے توحید کی تعلیم دی، شرک سے اجتناب کی تلقین کی، اطاعتِ الٰہی پر ابھارا، حلال وحرام اور جائز وناجائز کے ضابطے بتائے، وعظ وتبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول واضح کئے اور ان ساری تعلیمات کو نظم کی لڑی میں اس طرح منسلک کر دیا کہ ذرا سا دھاگہ ٹوٹا اور سارے موتی منتشر ہو گئے۔ قرآنی بلاغت ادب کے تمام اسالیب کی جامع ہے جس کی نظیر انسانی وجود پیش نہیں کر سکتا۔ الفاظ کو اس طرح موبوط بنا دیا گیا ہے کہ اگر انہیں ان کے مخصوص مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیا جائے تو مفہوم گڑ بڑ ہو جائے یا وہ چاشنی اور رونق باقی نہ رہے جو قرآن میں موجود ہے۔''[۸]

یہی بات قاضی عبدالجبار معتزلی اس طرح پیش کرتے ہیں:

''یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ فصاحت مفرد کلمات میں نہیں ہوتی، بلکہ ایک مخصوص طریقہ کو اختیار کر کے کلام میں نظم وارتباط پیدا کرنے سے فصاحت پیدا ہوتی ہے۔ نظم وتالیف کے ساتھ ہر لفظ کی ایک صفت ہونی چاہیے۔ یہ صفت بسا اوقات نظم و ترکیب سے اپنا مقام بناتی ہے اور کبھی اعراب کے ذریعہ اور کبھی موقع ومحل سے امتیاز حاصل کر لیتی ہے۔ ان تینوں کے علاوہ کوئی چوتھی شکل نہیں ہے..... اگر کوئی شخص اعتراض کرے کہ فصاحت میں حسنِ معنی بھی شامل ہے، پھر تم نے اس کا خیال کیوں نہیں رکھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معانی کا حسن گرچہ ناگزیر ہے، لیکن ان میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے یہ صورت حال دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے والوں میں سے ایک شخص فصاحت میں دوسرے پر بازی لے جاتا ہے، جبکہ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ معانی میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس صورت میں تفاوت ان لفاظ میں ہوگا جو اظہار کا جامہ زیب کرتے ہیں۔ اگر یہ جملہ صحیح ہے تو خصوصیت دراصل تالیف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کلمات مخصوص ہوتے ہیں،

یا تقدیم و تاخیر سے نکھار آتا ہے جو موقع و محل کے لیے خاص ہیں، یا پھر حرکات سے حسن پیدا ہوتا ہے جو اعراب کے ساتھ خاص ہیں اور اسی سے کلام میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔''[۹]

نظمِ قرآن بمعنی مُناسبتِ آیات و سُوَر:

متقدم علمائے بلاغت کے ہاں نظم کی اصطلاح جس پس منظر میں مستعمل تھی اسے برقرار رکھتے ہوئے اس میں توسیع سب سے پہلے جس مفسر نے کی، وہ علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر جاراللہ الزمخشری المعتزلی (۴۶۷ھ۔۵۳۸ھ) ہیں۔علامہ زمخشری اس بات کے بھی قائل تھے کہ قرآن مجید اپنے جملوں کی ترکیب و تنظیم کے حسن بلاغت کی وجہ سے معجزہ ہے۔اس کے مقابلہ کا بلیغ جملہ پیش کرنے سے مخلوق قاصر ہے۔چنانچہ سورہ نساء کی آیت ۱۶۶ (وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَشْهَدُ.....) کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اللہ نے قرآن کو اپنے اس علم خاص کے ساتھ نازل کیا ہے جس سے کوئی واقف نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کی ترتیب و تنظیم ایسے سلوب اور نظم کے مطابق ہے جو ہر صاحبِ بلاغت اور صاحبِ بیان کے بس سے باہر ہے.....اور قرآن کی صحت اور صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کا نزول ایسے معجزانہ نظم کے ساتھ ہوا ہے جو ہر کسی کی طاقت سے بلند ہے۔''[۱۰]

زمخشری نے نظم قرآن کی اصطلاح کو مزید وسعت دیتے ہوئے مختلف آیات کے باہمی نظم و ربط تلاش کرنے کی طرف بھی توجہ دی۔اس سلسلہ میں انھوں نے جو کوشش کی ہے اس کے چند نمونے سطورِ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

۱).....سورۂ اعراف میں حضرت آدمؑ و ابلیس کا واقعہ بیان ہوا ہے اور اس کا اختتام اس آیت پر کیا گیا ہے:

﴿قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ﴾[الاعراف: ۲۴.۲۵]

اس کے فوراً بعد یہ آیت ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ﴾[الاعراف: ۲۶]

اس آیت کا ماقبل سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا، مگر زمخشری ان میں نظم ثابت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ آیت سیاقِ کلام سے منقطع ہوکر عَلٰی سَبِیلِ الْاِسْتِطْرَادُ آ گئی ہے۔اس سے پہلے کے واقعہ میں ہبوطِ آدم کا تذکرہ تھا اور کہا گیا تھا کہ آدم کے ستر کھل گئے او روہ اپنے جسم کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔یہاں لباس کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ اپنے احسان کا اظہار کررہا ہے او راس بات سے باخبر کررہا ہے کہ ننگا پن اور عریانیت باعثِ فضیحت ورسوائی ہے اورستر پوشی تقوی کا عظیم باب ہے۔''[۱۱]

۲).....سورت نساء میں ایک یہ آیت ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْجَآءَ اَحَدٍ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ اَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾[النسآء:۴۳]

یہاں صاحب کشاف(زمخشری) نے اس آیت کے ضمن میں پہلے یہ سوال اٹھایا ہے کہ قرآن مجید نے مریضوں ،مسافروں، بے وضواور جنبی لوگوں کو ایک ہی لڑی میں کیونکر پرو دیا ہے، جب کہ بیماری او رسفر تو رخصت کے اسباب ہیں۔حدث وجوب ِوضوکا سبب ہےاور جنابت وجوبِ غسل کا سبب ہے۔آخر اس ترتیب وتنظمِ کلام کا کیا سبب اور حکمت ہے؟ پھراس کے جواب میں فرماتے ہیں:''جن لوگوں پر طہارت واجب ہوچکی ہو،لیکن پانی نہ ملنے کی وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے وہ اس کا استعمال نہیں کرسکتے، ایسے لوگوں کو خدا کی طرف سے مٹی سے تیمّم کی رخصت دی جارہی ہے۔چنانچہ ان میں سے مریضوں اور مسافروں کو پہلے رخصت دی گئی اور ان کا تذکرہ سب سے پہلے ہوا، کیونکہ یہ لوگ اس لحاظ سے اولیت کے مستحق تھے کہ یہ اسباب بکثرت اور بتکرار پیش آتے ہیں اور ان سے انسان کو زیادہ سامنا ہوتا ہے۔اس کے بعد بطورعموم ان سب کا ذکر کردیا گیا جن پر طہارت واجب ہواو روہ پانی کے استعمال پر قادر نہ ہوں،خواہ دشمن یا درندوں کے خوف سے یا برتن نہ ہونے کی وجہ سے یا پانی نہ ملنے کی وجہ سے۔کیونکہ مرض اور سفر کے مقابلہ میں یہ عوارض کم پیش آتے ہیں۔''[۱۲]

نظمِ قرآن کے سلسلہ میں آیات کی باہمی مناسبت پر جو گفتگو علامہ زمخشری کے ہاں ملتی ہے وہی آگے امام رازی (۵۴۴ھ۔۶۰۶ھ) کے ہاں بھی ملتی ہے، مگر زمخشری ہی کی طرح رازی کے ہاں بھی یہ متفرق طور پر کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے، پھر ان کے بعد امام بقاعی (۸۸۵ھم) نے بھی اس طرف توجہ کی اور ''**نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور**'' نامی اپنی تفسیر میں آیتوں اور سورتوں کے باہمی ربط و نظم پر کافی کام کیا۔ اسی طرح شیخ مخدوم علی مہائمی (۷۷۶ھ۔۸۳۵ھ) امام سیوطی (۸۴۹ھ۔۹۱۱ھ) شیخ محی الدین ابن عربی صوفی (۵۶۰ھ۔۶۳۸ھ) علامہ ابو جعفر ابن الزبیر (۶۲۷۔۷۰۸ھ) ابوالحسن علی بن احمد الحرالی (۶۳۷ھم) نے بھی نظم و مناسبت کی رعایت سے تفاسیر لکھی ہیں۔

پورے قرآن کا نظام

قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کے داخلی و خارجی نظم کے متعلق مذکورہ بالا اہل علم کے ہاں اگرچہ کافی بحثیں ملتی ہیں، مگر ان میں سے کسی کے ہاں یہ بحث نہیں ملتی کہ پورا قرآن مجید بھی ایک ایسی وحدتِ ترتیب اور تنظیم رکھتا ہے جو اسے شروع سے آخر تک ایک کتاب کی طرح منضبط کلام کی شکل مہیا کرتی ہے (شیخ اکبر ابن عربیؒ نے اس طرف کچھ اشارہ کیا ہے[۱۳] ان کا تذکرہ آگے آتا ہے)۔

متأخرین میں سے جن اہل علم نے پورے قرآن مجید کو مربوط و منظم کتاب کی طرح ایک وحدت دینے کی کوشش کی ہے، ان میں مولانا فراہی (۱۸۶۳ء۔۱۹۳۰ء) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے اس کے لیے نظمِ قرآن اور نظامِ قرآن کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ انہوں نے نظم قرآن کے سابقہ تصورات کو وسعت دیتے ہوئے ایک نیا نظریہ اور فلسفہ پیش کیا چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''بعض علماء نے آیات اور سورتوں کی باہمی مناسبت کے باب میں کئی تصانیف چھوڑی ہیں، لیکن نظم قرآن کے باب خاص میں کوئی تصنیف میرے علم میں نہیں آئی۔ میرے نزدیک نظام اور مناسبت میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ مناسبت نظام کا محض ایک حصہ ہوتی ہے۔''.....(آگے فرماتے ہیں) ''نظم سے ہماری مراد سورہ کے

اجزاء کی وہ باہمی مناسبت ہے جس کے معلوم ہونے پر پوری سورہ ایک وحدت میں ڈھل جائے۔ اس صورت میں کلام کا مفہوم اس قدر مربوط اور ایک ہی مرکزی مضمون کا حامل نظر آتا ہے کہ پوری سورہ مشخّص ہوکر سامنے آتی ہے اور کلام میں ایک جمال، ایک پختگی اور وضاحت کا ادراک ہوتا ہے۔ نظم محض ایک سورہ تک ہی محدود نہیں ہوتا، بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس سورہ کی مناسبت ان سورتوں کے ساتھ معلوم ہوجائے جو اس کے ساتھ متصل ہیں۔ اگر ان کے ساتھ ان کی مناسبت واضح نہ ہو تو ان سورتوں کے ساتھ اس کا تعلق معلوم ہوجائے جو اس سے پہلے یا بعد میں کچھ فاصلے پر واقع ہیں۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ جس طرح بعض آیات جملہ معترضہ کے طور پر کلام میں آجاتی ہیں اسی طرح بعض سورتیں بھی معترضہ سورتیں بن کر آئی ہوں۔ نظم معلوم ہوجانے کے بعد اول سے آخر پورا قرآن مناسبت وترتیب رکھنے والا اور کامل وحدت سے متصف نظر آئے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ نظم محض مناسبت یا محض ترتیبِ اجزاء سے زائد ایک چیز ہے۔''[۱۴]

مولانا فراہی نے نظمِ قرآن کا جو فلسفہ پیش کیا اس کی رو سے سورۂ فاتحہ اس آسمانی کتاب کا دیباچہ، معوذتین خاتمہ اور درمیانی سورتیں مختلف ابواب (گروپ) ہیں۔ ان ابوب کے الگ الگ مرکزی مضمون (عنوان) ہیں اور ہر سورت اپنے باب کی ایک فصل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس فصل کا بھی ایک مرکزی عنوان ہے جو اپنے باب (گروپ) کے مرکزی عنوان کے ساتھ ربط رکھتا ہے۔ یوں پورا قرآن ایک کتابی وتصنیفی ربط کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ مولانا فراہی کا یہ فلسفہ ان کے چند رسائل کے مجموعہ 'رسائل الامام فراہی' (ص ۱۰۳ تا ۱۱۰) میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور اس میں انہوں نے قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے ہر سورت کا مرکزی موضوع (عمود) اور پھر ان کے ابواب (گروپ) کا مرکزی موضوع بھی متعین کیا ہے۔ مولانا فراہی نے اپنے اس فلسفہ ونظریہ کو عملی شکل دیتے ہوئے قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی تفسیر بھی اسی نہج پر کی ہے، مگر وہ پورے قرآن کی تفسیر نہ کر پائے، البتہ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے اسی فلسفہ کی آبیاری کرتے ہوئے پورے قرآن مجید کی ضخیم تفسیر لکھی اور اپنی خداداد عقل وبصیرت سے ان تمام مباحث پر بھی قلم اٹھایا جنہیں ان کے

استاذ امام فراہی نے تشنہ چھوڑا تھا۔اس سلسلہ میں بعض مقامات پر انہوں نے اپنے استاد سے اختلاف بھی کیا ہے، جس کی تفصیل آ گے 'مولانا فراہی واصلاحی کے تفسیری اختلافات' کے عنوان کے تحت آ رہی ہے۔

یہ تو تھے اس علم کے آغاز وارتقاء سے متعلق چند مباحث۔اب ہم علوم قرآن اور اصول تفسیر کی روشنی میں اس علم کی حیثیت پر گفتگو کریں گے۔

علمِ نظمِ قرآن (علم المناسبة)

علوم قرآن پر دستیاب دو اہم کتابوں یعنی 'الاتقان فی علوم القرآن' (امام سیوطی) اور 'البرھان فی علوم القرآن' (امام زرکشی) میں اس علم پر کافی تفصیل سے بحث موجود ہے۔انہوں نے اس علم کے لیے نظم قرآن کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے اور علم المناسبة کی اصطلاح بھی۔چنانچہ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ:

المناسبة فی اللغة المشاکلة والمقاربة ومرجعها فی الآیات ونحوها الی معنی رابط بینهما، عام او خاص، عقلی او حسی او خیالی او غیر ذلک من انواع العلاقات، او التلازم الذهنی کالسبب والمسبّب والعلة والمعلول والنظیرین والضدین وغیره. [۱۵]

لغوی طور پر 'مناسبت' کا معنی ہے ایک دوسرے کے قریب اور مشابہ ہونا۔آیات (اور سورتوں) وغیرہ میں علم مناسبت سے مراد دو چیزوں کے مابین معنوی ربط کا نام ہے۔یہ ربط عام اور خاص کے درمیان بھی ہوسکتا ہے، خیالی (عقلی) اور حسّی کے درمیان بھی۔اسی طرح باہمی ربط (علاقات) کی دیگر قسموں میں سے کسی اور کے درمیان بھی۔علاوہ ازیں اس ربط کا تعلق تلازُمِ ذہنی سے بھی ہوسکتا ہے، مثلاً جس طرح سبب اور مسبب کے درمیان تعلق ہوتا ہے یا علت اور معلول کے درمیان یا دو نظیروں یا دو ضدوں کے درمیان ہوتا ہے۔

علمِ نظمِ قرآن میں جس طرح آیات کے باہمی ربط ونظم پر بحث کی جاتی ہے اسی طرح سورتوں کے باہمی ربط ونظم پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے، جیسا کہ امام سیوطی فرماتے ہیں:

''ابوجعفر بن زبیر جو امام ابوحیان کے شیخ تھے، انہوں نے اس موضوع پر ایک

کتاب لکھی، جس کا نام ہے: ''البرھان فی مناسبة ترتیب سور القرآن''۱۶؎

خود امام سیوطی نے بھی 'اسرار التنزیل' کے نام سے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی، پھر اس میں سے سورتوں کے باہمی ربط سے متعلقہ حصے کو انہوں نے الگ کتابی شکل دے دی اور اس کا نام رکھا: ''تناسق الدرر فی تناسب السور''۱۷؎

علمِ نظمِ قرآن کی اہمیت وافادیت اور مختلف نقطہ ہائے نظر:

علمِ نظمِ قرآن کی اہمیت وافادیت کے بارے میں اہلِ علم کی آراء مختلف رہی ہیں۔ بعض اہلِ علم اس کی افادیت کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر میں بھی اس سے فائدہ اٹھایا، جب کہ بعض اسے تکلفِ محض سے تعبیر کرتے تھے، چنانچہ شیخ عزالدین بن عبدالسلام اس ثانی الذکر طبقہ کی نمائندگی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

المناسبة علم حسن لكن يشترط في حسن ارتباط الكلام ان يقع في امر متحد مرتبط اوله بآخره فان وقع على اسباب مختلفة لم يشترط فيه ارتباط احدهما بالآخر (قال) ومن ربط ذلك فهو متكلّف بما لايقدر عليه الا بربط ركيك يصان عنه حسن الحديث فضلاعن احسنه فان القرآن نزل في نيف وعشرين سنة في احكام مختلفة ولأسباب مختلفة وماكان كذلك لايتاتى ربط بعضه ببعض.۱۸؎

علم المناسبہ (نظم قرآن) ایک اچھا علم ہے لیکن ربطِ کلام کی خوبی اس بات سے مشروط ہے کہ وہ کلام ایک ہی معاملہ سے متعلق ہو اور شروع سے آخر تک مربوط واقع ہوا ہو۔ لہٰذا اگر کلام مختلف مواقع پر پیش آیا ہو تو پھر اس کے باہم مربوط ہونے کی شرط نہیں لگائی جاسکتی، بلکہ ایسے کلام کو اگر کوئی شخص مربوط ومرتّب بنانے کی کوشش کرے گا تو وہ اس چیز کا تکلف کرے گا جو اس کی طاقت سے باہر ہے اور اس طرح وہ ایسا فضول ربط پیش کرے گا جو سب سے اچھے کلام میں تو دور کی بات ایک عام مناسب کلام کے بھی شایان شان نہیں ہوگا۔ قرآن مجید بیس سال سے کچھ زیادہ کی مدت میں مختلف حالات کے لیے گوناگوں احکام لے کر نازل ہوا اور جس چیز کا نزول اس طرح ہوا ہو اس میں کسی قسم کا ربط ونظم نہیں ہوسکتا۔

ماضی قریب کے مشہور مفسر امام شوکانی (۱۱۷۳ھ۔۱۲۵۰ھ) نے بھی نظمِ قرآن کی تلاش کو لایعنی اور وقت کا ضیاع قرار دیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۴۰ کے تحت رقم طراز ہیں:

''جان لو کہ بہت سے مفسرین نے ایک زحمت طلب علم دریافت کیا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے سمندر میں غوطہ زنی کی ہے جس میں تیرنے کے وہ مکلّف نہیں بنائے گئے۔ انہوں نے ایک ایسے فن میں اپنے اوقات صرف کئے جو ان کے لیے قطعی سود مند نہیں ہے، بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو ایسی مجرد رائے اور گمان سے کام لینے پر لگا دیا ہے جو کتاب الٰہی کے معاملات میں بالکل ممنوع ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ انہوں نے مصحف میں موجود ترتیب کے مطابق قرآنی آیات کی تنظیم کے درمیان مناسبت کا التزام کیا ہے اور اس راہ میں ایسے تکلّفات اور اس قدر تصنّع سے انہیں کام لینا پڑا ہے کہ حق و انصاف پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ کلام اللہ تو دور کی بات ماہرینِ بلاغت کا کام بھی ایسے تکلّفات سے مبرّا ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے اس موضوع پر علیٰحدہ سے کتابیں تصنیف کی ہیں اور مناسبت کو تالیف کا اہم ترین مقصد قرار دیا ہے، جیسا کہ بقاعی نے اپنی تفسیر میں کیا ہے۔ ان کے ان پیش روؤں نے بھی جن کا تذکرہ بقاعی نے اپنے مقدمہ میں کیا ہے اس طرح کی کوشش کی ہے۔ یہ بات ہر اس شخص کو عجیب وغریب معلوم ہوگی جو اس حقیقت سے واقف ہے کہ قرآن اپنے آغازِ نزول سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی وفات تک مختلف حالات وواقعات کے مطابق متفرق شکل میں اترا ہے۔ عالم کو چھوڑیئے، کوئی بھی صاحبِ عقل شخص اس امر میں شک نہیں کرسکتا کہ نزولِ قرآن کے مقتضیٰ یہ حالات وواقعات خود ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہیں، بلکہ بسا اوقات باہم متضاد بھی ہیں، جیسے ایک چیز کو حرام قرار دینا جو پہلے حلال تھی اور ایک چیز کو حلال قرار دینا جو پہلے حرام تھی، ایک امر کو کسی شخص یا کچھ اشخاص کے لیے ثابت کرنا، جب کہ وہ اس کے برعکس تھا جو پہلے ان کے لیے تھا، کبھی گفتگو مسلمانوں سے ہوتی ہے اور کبھی کافروں سے، کبھی خطاب ماضی کے لوگوں سے ہوتا ہے اور کبھی حال کے لوگوں سے۔ کبھی عبادت زیر بحث آتی ہے اور کبھی معاملات۔ کبھی ترغیب ہوتی ہے اور کبھی ترہیب، کبھی بشارت ہوتی ہے تو کبھی انذار، کبھی

دنیا زیر بحث ہوتی ہے کبھی آخرت ،بسا اوقات درپیش مسائل اور پریشانیوں کا بیان ہوتا ہے اور بسا اوقات گزرے ہوئے قصے اور داستانیں مذکور ہوتی ہیں۔ جب نزول کے اسباب اس قدر مختلف اور ایک دوسرے سے اتنے جدا ہیں کہ ان میں وحدت اور ہم آہنگی کا کوئی موقع نہیں ہے تو انہی اسباب میں نازل ہونے والا قرآن بھی اسی درجہ کے اختلاف کا مظہر ہوگا۔آخر کوئی صاحبِ عقل گوہ اور مچھلی کے درمیان ،آگ اور پانی کے درمیان اور ملاح اور حدی خواں کے درمیان مناسبت کیسے تلاش کرے گا۔کیا یہ ان لوگوں کے لیے شک کا دروازہ کھولنا اور شکوک کے دائرہ کو وسیع تر کرنا نہ ہوگا جن کے دلوں میں مرض ہے یا جن کی بیماری محض جہالت اور کوتاہی ہے ۔جب یہ مریضانِ قلب دیکھیں گے کہ اہلِ علم قرآن کی تمام آیتوں کے درمیان مناسبت پر گفتگو کر رہے ہیں اور اس پر علیٰحدہ کتابیں تصنیف کر رہے ہیں تو انہیں یقین ہوجائے گا کہ یہ ایک ناگزیر علم ہے اور یہ کہ قران اسی وقت بلیغ اور معجزہ مانا جائے گا، جب کہ مناسبت کی وجوہ ظاہر ہو جائیں اور ربط ومناسبت کو واجب کرنے والی چیز واضح ہوجائے۔اگر اسے آیات کے درمیان اختلاف نظر آئے اور وہ اس سلسلہ میں متکلمین کے اقوال کی طرف رجوع کرے اور وہاں اسے محض تکلّف اور تصنّع نظر آئے تو اس کے دل میں قرآن کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوجائے گی، حالانکہ اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے پہلے وہ اس طرح کے شکوک سے پاک تھا۔یہ صورت حال اس وقت درست ہوگی جب کہ یہ فرض کرلیا جائے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی قرآن نازل ہوا ہے۔آخر یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے جبکہ ہر وہ شخص جسے کتاب الٰہی کا ادنیٰ سا علم ہے اور وہ اس سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ صورت حال ایسی نہیں ہے۔اگر کسی کو اس میں شک ہو، اگرچہ اہل علم اس میں شک نہیں کر سکتے ،تو وہ اسباب نزول کے ان علماء کے کلام کا مطالعہ کرے جو واقعات وحالاتِ نبوت سے پوری طرح واقف تھے۔اس مطالعہ سے اس کا سینہ ٹھنڈا ہوجائے گا اور طویل سورتوں کو چھوڑ یئے، معتدل اور درمیانی سورتوں ہی پر غور کر کے اس کے شکوک وشبہات دور ہوجائیں گے۔ان سورتوں کے مطالعہ سے وہ اس

نتیجہ تک پہنچے گا کہ وہ ایسی آیات پر مشتمل ہیں جو مختلف حالات اور جدا جدا اوقات میں نازل ہوئی ہیں جن کے اسباب وحالات میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی، بلکہ یہاں صرف اسی پر غور کرلیا جائے کہ سب سے ابتداء میں اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ نازل ہوئی، پھر یٰـأَیُّهَا الْمُدَثِّرْ اور اس کے بعد یٰـأَیُّهَا الْمُزَمِّلْ کی آیات اتریں۔ بتایئے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب میں ان آیات اور سورتوں کی جگہ کیا ہے، جب صورت حال یہ ہے تو ان آیات کے درمیان مناسبت تلاش کرنے کے کیا معنی ہیں جن کے بارے میں قطعی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ مصحف کی ترتیب میں انہیں بعد میں رکھا گیا ہے جبکہ ان کا زمانۂ نزول پہلے کا ہے، یا مصحف میں انہیں پہلے رکھا گیا ہے جبکہ زمانۂ نزول بعد کا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق نزولِ قرآن کی ترتیب سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق ان صحابہ کے عمل سے ہے جو جمع وترتیب کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح کے علم کا فائدہ بہت کم اور اس کا ثمرہ بہت محدود ہے، بلکہ یہ صاحبِ فہم کے نزدیک محض تضییعِ اوقات اور ایسی چیز میں گھنٹوں کا صرف کرنا ہے جو عبث اور بے سود ہے۔ آپ خوب واقف ہیں کہ اگر ایک شخص مناسبت کی تلاش کے پیچھے پڑ جائے اور اہل ادب وبلاغت کے خطبوں، رسائل اور انشائیوں میں نظم ڈھونڈھنے لگے یا شعراء کے مدحیہ، ہجائیہ، غزلیہ اور مرثیہ قصائد اور خطبوں میں اور ان کے فقروں اور خاتموں میں مناسبت کے اسباب تلاش کرے، پھر ایک قدم آگے بڑھ کر مزید تصنّع کرے اور خطیب کے خطبۂ جہاد کی خطبۂ حج اور خطبۂ نکاح اور دوسرے تمام خطبوں میں وحدت پیدا کرے اور تعزیتی انشائیہ اور تبریکی انشائیہ میں تعلق قائم کرے تو ایسے شخص کو مریض اور فاتر العقل تصور کیا جائے گا جو اپنے اوقات سے کھلواڑ کر رہا ہے اور اپنی عمر عزیز کو داؤں پر لگا رہا ہے۔ جب اس مقام پر یہ حالت ہے کہ کلام انسانی میں اس فعل کو حماقت سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کلام خداوندی میں اس قسم کے عمل کو کیا کہا جائے گا جس کی بلاغت نے بڑے بڑے عرب زبان آوروں کو خاموش کر دیا اور جس کی فصاحت نے عدنان کے فصیح اللسان ادیبوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ہر شخص خواہ کم علم ہو یا مکمل عالم، جانتا ہے کہ اللہ نے

قرآن کی یہ صفت بتائی ہے کہ وہ عربی مبین ہے اور اسے عربوں کی زبان میں نازل کیا ہے اور اس میں عربوں کے مسالکِ ادب اور اندازِ تخاطب کو اختیار کیا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عربوں کا ایک خطیب ایک ہی مقام پر کھڑا ہو کر مختلف ومتضاد فنونِ کلام کو اختیار کرتا تھا، چہ جائیکہ متعدد مقامات کی بات ہو یا زندگی بھر کے اقوال اور خطبوں کا معاملہ ہو، یہی حال ان کے شاعروں کا تھا۔ یہاں ہم اس فساد پر اسی تنبیہ کو کافی سمجھتے ہیں جس کی وادیوں میں متعدد محققین نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہاں ہم نے اس بحث کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ روئے سخن اب بنی اسرائیل کی طرف مڑ گیا ہے جبکہ اس سے پہلے گفتگو ابوالبشر آدم کے سلسلہ میں ہو رہی تھی۔ اگر کوئی تکلّف وتصنّع کا عادی سوال کرے کہ ان آیات کا ماقبل سے کیا ربط اور مناسبت ہے تو ہمارا جواب ہوگا کہ کوئی ربط اور مناسبت نہیں ہے۔'' [19]

اسی طرح وہ تمام مفسرین بھی بالواسطہ اسی رائے کے قائل تھے جنہوں نے اپنی تفاسیر میں نظم قرآن کے حوالے سے کوئی بحث نہیں کی۔ اس لحاظ سے مفسرین کی بڑی تعداد اسی زمرے میں آتی ہے، جیسا کہ امام سیوطی نے امام رازی کے حوالے سے ان کا یہ قول درج کیا ہے:

رأیت جمهور المفسرین معرضین عن هذه اللطائف [20]

میں نے جمہور مفسرین کو دیکھا ہے کہ وہ اس (علمِ نظمِ قرآن) کے لطائف سے اعراض کرتے ہیں۔

اسی طرح امام زرکشی فرماتے ہیں:

وهذا النوع یهمله بعض المفسرین او کثیر منهم وفوائده غزیرة [21]

مفسرین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو اس علم (نظم قرآن) کی اہمیت کو نظر انداز کرتی ہے حالانکہ اس میں بڑے فوائد پنہاں ہیں

وہ اہل علم جو علم نظم قرآن کی افادیت کے قائل تھے ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے امام زرکشی 'البرھان' میں فرماتے ہیں:

قال بعض مشايخنا المحققين قد وهم من قال :لايطلب للآی الكريمة مناسبة ،لانها على حسب الوقائع المتفرقة وفصل الخطاب انهاعلى حسب الوقائع تنزيلا وعلى حسب الحكمة ترتيبا فالمصحف كالصحف الكريمة على وفق مافی الكتاب المكنون مرتبة سوره كلها وآياته بالتوقيف.....ومن المعجز البيّن اسلوبه ونظمه الباهر فانه :﴿كِتٰبٌ أُحْكِمَتْ آيٰتُه ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾قال :والذی ينبغی فی كل اٰية ان يبحث اول كل شئی عن كونها مكملة لماقبلها او مستقلة ثم المستقلة ، ما وجه مناسبتها لماقبلها؟ففی ذلک علم جم وهكذا فی السور يطلب وجه اتصالهابماقبلها وماسبقت له[۲۲]

ہمارے بعض محقق مشائخ کا کہنا ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید چونکہ حالات کے تقاضوں کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے اس وجہ سے اس میں نظم (مناسبت) تلاش کرنا ہی بے کار ہے ، ان کو دھوکا ہوا ہے۔ فیصلہ کن بات یہ ہے کہ قرآن مجید کو نازل تو حالات کے تحت متفرق طور پر کیا گیا ہے جب کہ اسے مرتب کیا گیا تو حکمت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا۔ یہ دیگر معزز صحائف کی طرح ہے اور اسی ترتیب کے ساتھ ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ اس کی سورتیں اور آیتیں توقیفی طور پر مرتب ہوئی ہیں ۔اس کا ایک اعجاز اس کا اسلوبِ بیان اور واضح نظم ہے کیونکہ یہ ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں ،پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔''

علمِ نظمِ قرآن سے بے توجہی کیوں رہی؟

آیتوں کے داخلی ربط اور سورتوں کے باہمی ربط میں چونکہ عقل ورائے کو زیادہ دخل ہوتا ہے، پھر اس میں خطا کا بھی صریح امکان ہوتا ہے، اس لیے اہل علم کی بڑی تعداد نے اس کو اہمیت نہیں دی۔علاوہ ازیں یہ کام انتہائی دقّت طلب بھی ہے۔ چنانچہ امام سیوطی فرماتے ہیں :

وعلم المناسبة علم شریف قل اعتناء المفسرین به لدقته وممن اکثرفیه الامام فخر الدین وقال فی تفسیره: اکثر لطائف القرآن مودعة فی الترتیبات والروابط. [۲۳]

نظم قرآن (مناسبت) کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے۔اس کے مشکل ہونے کی وجہ سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔جس شخص نے اس کا سب سے زیادہ اہتمام کیاہے وہ امام رازی ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر (مفاتیح الغیب) میں کہاہے کہ قرآن مجید کے لطائف کا بڑاحصہ اس کے ربط وترتیب میں چھپاہوا ہے۔

نظمِ قرآن کی افادیت کے قائل اہلِ علم

علم نظم قرآن کی افادیت کے قائل اہل علم میں سے ایک تو امام بقاعی ہیں جنہوں نے اسے مدنظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے جس کا نام ہے: ''**نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور**'' یہ تفسیر دائرۃ المعارف العثمانیہ (حیدرآباد) دکن سے شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں یہ معروف محقق عبد الرزاق مھدی کی تحقیق سے سات جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی ہے۔اس کے فلسفۂ نظم پر بحث آگے آئے گی۔اسی طرح اس کے ایک حامی ابوجعفر بن زبیر بھی ہیں جنہوں نے ''**البرھان فی مناسبة ترتیب سور القرآن**'' کے نام سے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی۔اسی طرح امام سیوطی خود بھی اس کے قائل تھے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

وکتابی الذی صنعته فی اسرار التنزیل کافل بذلک جامع لمناسبات السور والآیات مع ماتضمنه من بیان وجوه الاعجاز واسالیب البلاغة وقد لخصت منه مناسبات السور

میری وہ کتاب جسے میں نے قرآن مجید کے اسرارورموز کے حوالے سے مرتب کیاوہ اس سلسلہ میں مددگار ہے،اس میں آیتوں اور سورتوں کے باہمی ربط ونظم کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے وجوہِ اعجاز اور اسالیب بلاغت کو بھی نمایاں کیا گیاہے۔اس کتاب میں سے سورتوں کے باہمی نظم کے حصہ کی

خاصة فی جزء لطیف سمیته :تناسق الدرر فی تناسب السور. [۲۴]

تلخیص کرکے میں نے اسے الگ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا ہے او راس کا نام میں نے یہ رکھا ہے: تناسق الدر رفی تناسب السور.

علاوہ ازیں امام زرکشی ابن عربی (شیخ اکبر) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب ''سراج المریدین'' میں فرمایا:

ارتباط آی القرآن بعضها ببعض حتی تکون کالکلمة الواحدة متسقة المعانی منتضمة المبانی علم عظیم لم یتعرض له الا عالم واحد عمل فیه سورة البقرة ثم فتح الله عزوجل لنافیه فلمالم نجد له حملة ورایتنا الخلق باوصاف البطلة ختمنا علیه وجعلنا بیننا وبین الله ورددناه الیه ۔[۲۵]

آیاتِ قرآن کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں، ایک عظیم الشان علم ہے۔صرف ایک عالم نے اس علم سے تعرض کیا ہے۔اسی اصول پر اس نے پوری سورۂ بقرہ کو منظّم کر دیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے ہم پر یہ دروازہ کھولا۔لیکن ہم نے لوگوں کے اندر اس علم کے قدر دان نہیں پائے، ساری دنیا دوں ہمتوں اور کاہلوں سے بھری ہوئی ہے پس ہم نے اس کو مہر بند ہی رکھا او راپنے اور اپنے خدا کے درمیان کے اس معاملہ کو اسی کی طرف لوٹا دیا۔[۲۶]

اسی طرح شیخ ابوالحسن الشہر ابانی فرماتے ہیں:

اول من اظهر ببغداد علم المناسبة ولم نکن سمعناه من غیره هو الشیخ الامام ابو بکر النیسابوری وکان غزیز العلم فی الشریعة والادب وکان یقول

پہلے شخص جنہوں نے بغداد میں علمِ مناسبت (نظم) کو ظاہر کیا وہ ابو بکر نیشاپوری ہیں ۔فقہ وادب میں ان کا بڑا رتبہ تھا۔ان کے لیے منبر رکھا جاتا جس پر بیٹھ کر وہ قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے اور بتاتے کہ فلاں

علی الکرسی اذاقری علیه الآیة : لم جعلت هذه الآیة الی جنب هذه ؟و ماالحکمة فی جعل هذه السورة الی جنب هذه السورة؟ وکان یزری علی علماء بغداد لعدم علمهم بالمناسبة ۔[۲۷]

آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورت کے فلاں سورت کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے اور علمائے بغداد کی تنقیص کرتے کہ یہ لوگ نظم کے علم سے بالکل محروم ہیں ۔[۲۸]

اصولِ تفسیر میں نظمِ قرآن کی حیثیت

گزشتہ صفحات میں نظم قرآن کے حوالے سے جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین میں سے جن اصحاب علم نے نظم ومناسبت کے علم کی اہمیت وافادیت پر بات کی ہے انہوں نے اسے فوائد اور نکات کی قبیل سے شمار کیا ہے۔ جیسا کہ امام زرکشیؒ فرماتے ہیں:

''مفسرین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو اس علمِ نظم کی اہمیت کو نظر انداز کرتی ہے، حالانکہ اس میں بڑے فوائد پنہاں ہیں۔'' [۲۹]

علوم قرآن پر موجود جامع کتابوں میں بھی اسے اصول تفسیر یا شرائط تفسیر وشرائط مفسر میں جگہ نہیں دی گئی ۔ جمہور اہلِ سنت نے اصول تفسیر میں جن چیزوں کو بیان کیا ہے ان میں قرآن مجید کی تفسیر: (۱) قرآن ہی سے (۲) حدیث سے (۳) اقوالِ صحابہ سے (۴) اقوالِ تابعین سے (۵) اسرائیلی روایات سے (کچھ شرائط کے ساتھ) اور (۶) لغت عربی سے (کچھ شرائط کے ساتھ) کو تو بیان کیا ہے، مگر نظمِ قرآن کو ان اصولوں میں کہیں جگہ نہیں دی گئی ۔ مگر مولانا فراہی واصلاحی کے ہاں نظم قرآن کو بنیادی وکلیدی حیثیت دے دی گئی ہے ۔ ان اصحاب کے بقول نظم قرآن سے بے پرواہو کر قرآن مجید کی تفسیر کی ہی نہیں جاسکتی اور جنہوں نے نظم قرآن کی رعایت نہ کرتے ہوئے تفسیریں لکھی ہیں انہوں نے تفسیر قرآن میں غلط قدم اٹھایا ہے۔[۳۰]

مولانا فراہی نے تفسیر قرآن کے اصولوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) بنیادی اصول (۲) ترجیح کے اصول (۳) غلط اصول۔

پھر بنیادی اصول کے تحت چار طرح کے اصول پیش کیے ہیں:

(۱) نظمِ کلام اور سیاق وسباق کا لحاظ (۲) نظائرِ قرآن کی روشنی میں مفہوم کا تعین (۳) کلام میں مخاطب کا صحیح تعین، اور (۴) الفاظ کے شاذ معانی کا ترک۔

پھر ان میں سے پہلے اصول (یعنی نظمِ کلام) کے تحت رقم طراز ہیں:

''یہ اصول بنیادی اس لیے ہے کہ کوئی بھی کلام ایسے مفہوم کا متحمل نہیں ہوسکتا جو اس کے نظام کے مخالف اور اس کے معانی کو غیر مربوط کرنے والا ہو۔ ربطِ کلام تو ہر عاقل کے کلام کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا معجز کلام اس خصوصیت سے خالی کیسے ہوسکتا ہے؟ تفسیر کا یہ اصول نہایت واضح تھا، لیکن بعض منحرف لوگوں نے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی اور بعض حدیثیں ایسی گھڑ دیں جن کے باعث ناپختہ عقل رکھنے والے صالح اہل ایمان بھی فتنہ میں مبتلا ہوگئے۔'' [۳۱]

پھر آگے تفسیر قرآن کے ''غلط اصول'' کے تحت یہ اصول لکھا ہے:

''قرآن کی تاویل حدیث کی روشنی میں کرنا، جب کہ حدیث کی تاویل قرآن کی روشنی میں ہونی چاہیے۔'' [۳۲]

پھر ایک مثال کے بعد رقم طراز ہیں:

''یہیں ایک چیز پر خطر اور صحیح بات سے پھسلانے والی بھی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کی بات کو اچھی طرح سمجھنے سے پہلے اگر تم حدیث پر پل پڑو گے جس میں صحیح اور سقیم دونوں طرح کی احادیث ہوں تو تمہارا دل بعض ایسی رایوں میں اٹک سکتا ہے جن کی قرآن میں کوئی اساس نہ ہو اور کبھی وہ قرآن کی ہدایت کے برعکس بھی ہوں۔ اس کے نتیجہ میں تم قرآن کی تاویل میں اعتماد حدیث پر کرو گے اور تم پر حق وباطل گڈمڈ ہو جائیں گے۔ پس سیدھا راستہ یہ ہے کہ تم قرآن سے ہدایت پاؤ۔ اس پر اپنے دین کی بنیاد رکھو، اس کے بعد احادیث پر نگاہ ڈالو۔ اگر کوئی حدیث بادیٔ النظر میں قرآن سے ہٹی ہوئی ہو تو اس کی تاویل کلام اللہ کی روشنی میں کرو۔ اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت

نکل آئے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں گی۔ اگر اس میں ناکامی ہوتو حدیث کے معاملہ میں توقف کرواور قرآن پرعمل کرو۔'' ۳۳

اسی طرح مولانا فراہی ''تفسیر کے خبری ماخذ'' کے تحت لکھتے ہیں:

''بعض ماخذ اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع کی۔ اصل و اساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے، اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں: (۱) احادیث (۲) قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات (۳) گزشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔ اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن ۳۴ اور شبہ کو دخل نہ ہوتو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے، بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ میں سے ان روایات کو نہ لے جو اصل کو ڈھانے والی ہوں۔ بعض روایتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی تاویل نہ کی جائے تو ان کی زد براہ راست اصل پر پڑتی ہے اور ان سے سلسلۂ نظم درہم برہم ہوتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ آیت کی تاویل تو کر ڈالتے ہیں، لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے۔ بلکہ بسا اوقات تو صرف آیت کی تاویل پر ہی بس نہیں کرتے، بلکہ اس کے نظام کی بھی قطع و برید کر ڈالتے ہیں۔ حالانکہ جب اصل و فرع میں تعارض ہوتو کاٹنے کی چیز فرع ہے نہ کہ اصل..... اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوصِ قرآن کی تکذیب کرتی ہیں، مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے جھوٹ بولنے کی روایت یا آنحضرت ﷺ کے خلافِ وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت۔ اس طرح کی روایات کے بارہ میں ہم کو نہایت محتاط ہونا چاہیے۔ صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق وتائید کریں۔ مثلاً جو آثار حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں وہ بالعموم نظم قران سے بہت اقرب ہیں..... اگر کوئی شخص فروع میں سے کسی بات کا منکر ہوتو وہ قرآن کے منکروں کی طرح نہیں ہوسکتا۔'' ۳۵

مولانا فراہی مزید فرماتے ہیں:

''احادیث وروایات کے ذخیرہ سے صرف وہی چیزیں لینی چاہئیں جو نظمِ قرآن کی تائید کریں، نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کردیں۔''[۳۶]

نیز فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک سب سے زیادہ بے خطر راہ یہ ہے کہ استنباط کی باگ قرآن مجید کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اس کا نظم وسیاق جس طرف اشارہ کرے اسی طرف چلنا چاہیے۔''[۳۷]

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے استاد کے انہی تفسیری اصولوں کو قرآن کے داخلی اور خارجی وسائل میں تقسیم کرکے مزید منقح کردیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''میں نے اس (تفسیر تدبر قران) میں فہم قرآن کے ان وسائل وذرائع کو اصل اہمیت دی ہے جو خود قرآن کے اندر موجود ہیں، مثلاً قرآن کی زبان، قرآن کا نظم اور قرآن کے نظائر وشواہد۔ [آگے چل کر مولانا نے پہلے اصول کو لغتِ عرب، دوسرے کو نظمِ قران اور تیسرے کو تفسیرِ قرآن بالقرآن سے تعبیر کیا ہے۔ ناقل] دوسرے وسائل جو قرآن سے باہر کے ہیں، مثلاً حدیث، تاریخ، سابق آسمانی صحیفے اور تفسیر کی کتابیں، اگرچہ اپنے امکان کی حد تک میں نے ان سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، لیکن ان کو داخلی وسائل کے تابع رکھ کر ان سے استفادہ کیا ہے۔ جو بات قرآن کے الفاظ [مراد پہلی چیز یعنی لغت عرب۔ ناقل]، قرآن کے نظم اور قرآن کی خود اپنی شہادتوں اور نظائر سے واضح ہوگئی ہے، وہ میں نے لے لی ہے۔ اگر کوئی چیز اس کے خلاف میرے سامنے آئی تو میں نے اس کی قدر وقیمت اور اہمیت کے اعتبار سے اس کو جانچا ہے اور اگر دینی وعلمی پہلو سے وہ کوئی اہمیت رکھنے والی بات ہوئی ہے تو میں نے اس پر تنقید کرکے اس کو سمجھنے اور اس کے صحیح پہلو کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر بات کچھ یوں ہی سی ہوئی ہے تو اس کو نظر انداز کردیا ہے۔''[۳۸]

مولانا فراہی واصلاحی کے مندرجہ بالا اقتباسات میں کئی چیزیں محل نظر ہیں۔ ان میں سے ایک چیز روایات کا قرآن کے خلاف ہونے کا مسئلہ بھی ہے۔ فراہی واصلاحی کے ہاں روایات کے خلافِ قرآن ہونے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ روایت، قرآن

کے ظاہری الفاظ کے خلاف ہو اور دوسرا یہ کہ روایت قرآن مجید کے الفاظ سے حاصل ہونے والے نظم کے خلاف ہو۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں محدثین کی شرائط پر پوری اترنے والی کوئی صحیح روایت کیا قرآن کے ظاہری الفاظ کے اس طرح خلاف ہوسکتی ہے کہ اس میں اور قرآن میں کوئی جمع وتطبیق کی گنجائش نہ رہے؟ یہ الگ تفصیل طلب موضوع ہے۔ یہاں اس دوسرے پہلو پر کچھ عرض کیا جائے گا کہ کوئی روایت نظم قرآن کے خلافِ ہو تو کیا اسے بھی خلاف قرآن کہہ کر رد کیا جاسکتا ہے؟

یہ بات یاد رہے کہ نظم قرآن کے سلسلہ میں جن اہلِ علم نے قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی نظم ومناسبت کے مختلف پہلو اُجاگر اور مختلف نظام قائم کیے ہیں یہ سب ان کی ذہنی کاوشیں ہیں۔ اب اگر کوئی روایت اس نظام (نظم قرآن) کے خلاف ہو تو اسے ان کے ذہنی کاوش سے تیار کردہ 'نظام قرآن' کے خلاف تو کہا جاسکتا ہے، مگر 'قرآن' کے خلاف نہیں۔ اس سلسلہ میں ہم یہ واضح کریں گے کہ نظمِ قرآن کی تلاش خالص عقلی کاوش ہے اور پھر جن اہل علم نے اس طرف تعقّل وتفکّر کر کے نظم ومناسبت کی مختلف شکلیں پیش کی ہیں، وہ سب عقلی کاوشیں ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، حتی کہ خود فراہی و اصلاحی کے ہاں بھی ایسے کئی اختلافات بالکل واضح ہیں۔ اس کے بعض نمونے آگے پیش کیے جائیں گے۔ یہاں اس پہلو کو واضح کرنے کے لیے کہ 'نظم قرآن کی تلاش خالصتاً غور وفکر پر مبنی ہے'، ترتیبِ قرآن اور نظمِ قرآن کے فرق کو واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بعض حضرات نظم قرآن کے ثبوت کی بنیاد ان دلائل پر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا تعلق صریح طور پر ترتیبِ قرآن سے ہے۔

ترتیبِ قرآن اور نظمِ قرآن میں فرق:

قرآن مجید کی ترتیب وتدوین اور نظمِ قرآن (یعنی علم المناسبۃ) دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ترتیبِ قرآن میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ قرآن مجید جس ترتیب کے ساتھ آج ہمارے سامنے کتابی شکل میں موجود ہے، کیا عہدِ نبوی میں بھی اس کی یہی ترتیب تھی؟

اور کیا اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کی جاتی تھی؟ جبکہ نظم قرآن اس سے اگلا مرحلہ ہے جس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ ایک آیت کے الفاظ اور جملوں کا داخلی طور پر ایک دوسرے سے کیا ربط ہے؟ مثلاً غفور رحیم میں غفور کے بعد رحیم لانے کی کیا وجہ ہے؟ عذاب کی وعید سناتے ہوئے اچانک جنت کا ذکر کیوں آتا ہے؟ اسی طرح جنت کی باتیں بتاتے ہوئے اچانک جہنم کا تذکرہ کیوں آجاتا ہے؟ نیز یہ غور وخوض کیا جاتا ہے کہ ایک آیت کا مابعد اور ماقبل کی آیات کے ساتھ کیا ربط ہے؟ اسی طرح ایک سورت کی تمام آیات کا ایک دوسرے سے کیا ربط ہے؟ پھر ایک سورت کا ماقبل اور مابعد کی سورتوں سے کیا ربط ہے؟ سورۂ فاتحہ کا سورۂ بقرہ سے اور سورۂ بقرہ کا سورۂ آل عمران سے کیا ربط وتعلق ہے؟

اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ بعض پہلوؤں سے نظمِ قرآن اور سیاقِ کلام میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ سیاق وسباق کا تعلق ایک آیت یا بعض اوقات چند آیات تک محدود ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ پوری کی پوری سورت یا پورے کے پورے قرآن کا ایک ہی سیاق وسباق ہو۔ مثلاً سورۂ آل عمران میں جنگِ احد کے بارے میں چند آیات ہیں اور وہیں تک آیات کا خاص سیاق وسباق ہے، مگر پوری سورت کو جنگ احد کے سیاق و سباق کے تناظر میں دیکھنا غلط فہمی ہے۔ جب کہ نظم قرآن میں پوری کی پوری سورت بلکہ پورے قرآن کو ایک ہی تناظر میں دیکھنے اور ایک ہی لڑی میں پرودینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

علومِ قرآن پر لکھی گئی کتابوں میں ترتیبِ قرآن اور نظمِ قرآن، دونوں پر الگ الگ بحث کی گئی ہے، مثلاً امام سیوطی نے اپنی کتاب 'الاتقان' کی پہلی جلد کی اٹھارہویں نوع میں 'جمع وترتیبِ قرآن' پر بحث کی ہے، جبکہ 'نظمِ قرآن' کی بحث انہوں نے دوسری جلد کی باسٹھویں نوع میں جاکر اٹھائی ہے۔

ترتیبِ قرآن اور نظمِ قرآن کی ٹھوس شہادتوں کا مسئلہ:

جب ہم ترتیبِ قرآن یا نظمِ قرآن کے حوالے سے کوئی حتمی رائے قائم کریں گے تو لامحالہ اس کے لیے کوئی ٹھوس اور معیاری دلیل بھی فراہم کرنا ہوگی۔ جہاں تک

قرآن مجید کی جمع وترتیب کی موجودہ شکل کا سوال ہے تو اس سلسلے میں تین باتیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) کیا اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں قرآن مجید ایک مصحف کی شکل میں جمع کرلیا گیا تھا؟

(۲) کیا قرآن مجید کی سورتوں میں سے ہر سورت میں موجود آیات کی موجود شکل اللہ کے رسول ﷺ نے مقرر فرمائی تھی؟

(۳) کیا سورتوں کی موجودہ ترتیب بھی آنحضرت ﷺ ہی نے بتائی تھی؟

جہاں تک پہلا سوال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن مجید کو ایک مصحف کی شکل میں نہیں لکھوایا، البتہ قرآن مجید کا جب اور جتنا حصہ نازل ہوتا آپؐ اپنے کاتبینِ وحی میں سے کسی کو بلوا کر وہ حصہ اسے لکھوا دیتے۔ اس طرح پورا قرآن مجید الگ الگ حصوں میں لکھ لیا گیا: جیسا کہ کاتبینِ وحی میں سے ایک مشہور صحابی حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں:

کنا عند رسول اللہ ﷺ نؤلف القرآن من الرقاع.....(۳۹)	ہم اللہ کے رسول ﷺ کے پاس ہوتے تھے او رقرآن مجید کو رقاع (مخصوص کپڑے) پر لکھا کرتے تھے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں میں موجود آیات کی ترتیب اللہ کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ ہے۔ کیونکہ یہ آیات اگرچہ مختلف مواقع پر نازل ہوتی تھیں، مگر آپؐ انہیں نزولی ترتیب سے نہیں لکھواتے تھے، بلکہ ایک مخصوص ترتیب سے لکھواتے تھے اور وہی ترتیب آج ہمارے پاس موجود ہے، کیونکہ نزولی ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ سورۂ علق اور دیگر مکی سورتوں کو قرآن مجید کے آغاز میں رکھا جاتا، اس لیے کہ یہ پہلے نازل ہوئی تھیں اور مدنی سورتوں کو ان کے بعد جگہ دی جاتی، کیونکہ وہ بعد میں نازل ہوئی تھیں، مگر قرآن مجید کی موجودہ ترتیب، جو تواتر سے ہم تک پہنچی ہے، تقریباً اس کے برعکس ہے۔ امام سیوطی نے اس سلسلہ میں ایک فصل قائم کی ہے جس کا عنوان ہے:

ترتیب الآیات توقیفی ،اس کے تحت لکھتے ہیں:

الاجماع والنصوص المترادفة علی ان ترتیب الآیات توقیفی لاشبهة فی ذلک اما الاجماع فنقله غیر واحدمنهم الزرکشی فی البرهان وابوجعفر بن الزبیر فی مناسباته وعبارته: ترتیب الآیات فی سورها بتوقیفه وامره من غیر خلاف فی هذا بین المسلمین [۴۰]	اجماعِ امت اور بے شمار نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے او راس میں قطعاً شبہ نہیں ،جہاں تک اس پر اجماع کا تعلق ہے تو اس کا دعوی کئی ایک اہل علم نے کیا ہے مثلا امام زرکشی نے برھان میں ،ابو جعفر نے اپنی کتاب 'مناسبات' میں۔ ابوجعفر کی عبارت یہ ہے :سورتوں میں موجود آیات کی ترتیب توقیفی ہے اوراس کے توقیفی ہونے میں مسلمانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

پھر اس کے بعد امام سیوطی نے تقریبا بیس احادیث نقل کی ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے مثلا: ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

من حفظ عشر آیات من اول سورة الکهف عصم من الدجال (۴۱)	جس شخص نے سورۂ کہف کی پہلی دس آیات کی تلاوت کرلی وہ دجال سے محفوظ کردیا گیا۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے:

''جس شخص نے سورۂ بقرہ کی آخری دوآیتوں کی رات میں تلاوت کی اس رات وہ دوآیتیں اس کے لیے کافی ہوجائیں گی۔''(۴۲)

ان روایات میں مختلف سورتوں کی پہلی یا آخری آیات کی تلاوت کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ظاہر ہے، یہ آیات اپنی اپنی سورتوں میں کسی ترتیب کے ساتھ جمع کی گئی تھیں تبھی تو آنحضرت ﷺ نے پہلی آیات یا آخری آیات کی طرف اشارہ کرکے ان کی

فضیلت بیان فرمائی۔اگر یہ مرتب نہ ہوتیں تو آپ پہلی یا آخری کا اشارہ دینے کی بجائے صاف طور پر ان آیات کی تلاوت کرتے اور تلاوت کرنے بعد فرماتے کہ ان آیات کی یہ فضیلت ہے۔

تیسرا سوال، جو سورتوں کی ترتیب کے بارے میں تھا، اس کے متعلق امام سیوطی فرماتے ہیں:

واماترتیب السور فھل ھوتوقیفی ایضا اوھو باجتھاد من الصحابۃ ؟خلاف: فجمھور العلماء علی الثانی منھم مالک والقاضی ابو بکر فی احد قولیہ۔[۴۳]	سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے یا اس کی بنیاد صحابہ کا اجتہاد ہے؟ اس میں اختلاف ہے جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ صحابہ نے اجتہاد سے سورتوں کو ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کی اور ایک قول کے مطابق قاضی ابو بکر کی بھی یہی رائے ہے۔

پھر آگے چل کر امام سیوطی امام زرکشی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان دو گروہوں میں پیدا ہونے والا اختلاف لفظی نوعیت کا ہے، کیونکہ دوسرا گروہ (جو ترتیبِ سُوَر کو صحابہ کے اجتہاد پر مبنی قرار دیتا ہے وہ بھی) اسی بات کا قائل ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہؓ کو اس ترتیب کا اشارہ دے دیا تھا، کیونکہ یہ صحابہ قرآن مجید کے نزول کے اسباب اور موقع ومحل سے بخوبی آگاہ تھے۔اسی بنیاد پر امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کو اسی ترتیب سے جمع کیا جس ترتیب سے انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا تھا۔حالانکہ امام مالکؒ اس بات کے قائل ہیں کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ نے ازراہ اجتہاد قائم کی تھی۔اس لحاظ سے گویا یہ اختلاف اس نکتے پر جمع ہوجاتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب آنحضرت ﷺ کی قولی شہادت پر ہے یا فعلی استناد پر۔''[۴۴]

اس ساری بحث سے کم ازکم یہ واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں اور سورتوں کی جمع وترتیب کے پیچھے نصوص موجود ہیں اور پھر اجماعِ امت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔لیکن جب ہم نظمِ قرآن کے حوالے سے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ

آیات کا ایک دوسرے سے اور سورتوں کا آپس میں کیا ربط ہے؟ فاتحہ کے بعد بقرہ، پھر آل عمران، پھر نساء لانے میں کیا حکمت کارفرما ہے؟ معوذتین کو آخر میں رکھنے میں کیا راز ہے؟ سورۂ بنی اسرائیل کو کلمات تسبیح سے اور سورۂ کہف کو کلمۂ تحمید سے شروع کرنے کا کیا مقصد ہے؟ تو یہ ساری باتیں ہمارے ذاتی خیالات اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ جس آیت کو جہاں اور جس سورت کو جس جگہ مقرر کیا گیا ہے اس میں ضرور اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے، مگر یہ حکمت اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتائی نہیں نہ آنحضرت ﷺ نے ایسی کوئی حکمت ہمارے سامنے کھولی ہے اور نہ صحابہ کرامؓ اور تابعینِ عظامؒ سے اس سلسلہ میں کوئی مباحث یا نوادرات ہمیں ملتے ہیں۔ جمہور مفسرین نے بھی اس سلسلہ میں کوئی رائے نہیں دی۔ (باقی آئندہ)

حواشی و مراجع

۱۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، مقدمہ، جلد ا صفحہ ۲۵، ۲۶۔ فاران فاؤنڈیشن لاہور، طبع جون ۱۹۹۳ء۔ نیز دیکھیے: فراہی حمید الدین (عبد الحمید) رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، صفحہ ۱۰۳، ۱۰۵، ادارہ الاصلاح سرائے میر، یوپی، انڈیا، ط ۱۹۹۱ء، بحوالہ 'تفسیر قرآن کے اصول' ترجمہ از خالد مسعود، صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ط ۱۹۹۸ء۔

۲۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد ا صفحہ ۱۳، ۱۴، ادارہ ترجمان القرآن لاہور ط جولائی ۲۰۰۰ء۔

۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۔

۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۱۔

۵۔ تدبر قرآن،، جلد ا، صفحہ ۲۴۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۷۔ تفہیم القرآن، ص ۱۹، ۲۰۔

۸۔ خطابی، حمد بن محمد، البیان فی اعجاز القرآن، تصحیح، ڈاکٹر عبد العلیم، ص ۹، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، س ن۔ بحوالہ 'قرآن کریم میں نظم و مناسبت' از عبید اللہ فہد فلاحی، ص ۹۰،

دار التذکیر لاہور، ط ،۱۹۹۹ء۔

۹۔ اسد آبادی ،عبدالجبار ، المغنی فی ابواب التوحیدوالعدل ، ج۱۲ص ۱۱۹،۲۰۰، وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی ،ایران، س ن۔

۱۰۔ زمخشری، جاراللہ محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، ج۲ص ۲۵۹، مطبعہ الاستقامۃ مصر، ۱۹۲۶ء۔

۱۱۔ تفسیر الکشاف ، ج ۲ص ۶۷۔

۱۲۔ ایضاً ، ج ۱ص ۳۹۸، ۳۹۹۔

۱۳۔ زرکشی، محمد بن عبداللہ، البرھان فی علوم القرآن، جلد ۱، صفحہ ۳۲۔

۱۴۔ رسائل الامام الفراہی ،ص ۸۸، ۸۹، بحوالہ 'تفسیر قرآن کے اصول' ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

۱۵۔ سیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر، الاتقان فی علوم القرآن ، جلد ۲، صفحہ ۲۱۸، دار الکتاب العربی، بیروت ،طبعۃ اولیٰ ۱۹۹۹ء۔اس سے ملتی جلتی تعریف امام زرکشی نے بھی البرھان میں کی ہے، دیکھیے: البرھان فی علوم القرآن، جلد ۱، صفحہ ۳۵۔

۱۶۔ الاتقان، ج ۲، ص ۲۱۶۔ ۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ البرھان ، ج ۱ص ۳۷۔

۱۹۔ شوکانی، محمد بن علی بن محمد، فتح القدیر، ج ۱ص ۱۰۷تا۱۰۹، دار الکتب العربی، بیروت۔ الطبعۃ الاولیٰ ،۱۹۹۹ء۔

۲۰۔ الاتقان، ج ۲ص ۲۔ ۲۱۔ البرھان ، ج ۱ص ۳۶۔

۲۲۔ ایضاً ، ج ۱ص ۳۷۔امام سیوطی نے بھی یہی بات 'الاتقان' میں نقل کی ہے اور وہاں مشایخنا کی جگہ شیخ ولی الدین ملوی کا نام ذکر کیا ہے۔دیکھیے :الاتقان، ج ۲، ص ۲۱۷۔

۲۳۔ الاتقان ، ج ۲ص ۲۱۶، نیز دیکھیے : البرھان ، ج ۱ص ۳۶۔

۲۴۔ الاتقان، ج ۲ص ۲۱۶۔

۲۵۔ البرھان ، ج ۱ص ۳۲۔

۲۶۔ ترجمہ از امین احسن اصلاحی بحوالہ 'مجموعہ تفاسیر فراہی' ص ۳۱، ۳۲۔

۲۷۔ البرھان ، ج ۱ص ۳۲۔

۲۸۔ ترجمہ از اصلاحی ، مجموعہ تفاسیر فراہی ، ص ۳۱۔

۲۹۔ البرھان، ج۱ص ۳۶۔

۳۰۔ اصلاحی، امین احسن، مبادیٔ تدبر قرآن، ص ۸۷، ۹۷، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ط، ستمبر ۲۰۰۴ء۔

۳۱۔ رسائل الامام الفراہی، ص ۸۸، ۸۹، بحوالہ ''تفسیر قرآن کے اصول'' ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۷۸، بحوالہ 'تفسیر قرآن کے اصول' ص ۱۹۰۔

۳۳۔ ایضاً۔

۳۴۔ آگے چل کر واضح کیا جائے گا کہ نظمِ قرآن جسے مولانا نے تفسیرِ قرآن کا پہلا بنیادی اور اساسی (اصل) قاعدہ قرار دیا ہے، وہ بھی سراسر ظن وتخمین پر مبنی ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ حدیثِ رسولؐ خواہ وہ کتنے ہی ثقہ ومعتبر راویوں سے کیوں نہ مروی ہو، اسے تو اصولِ تفسیر میں ظن کی بنیاد پر 'فرع' کی حیثیت دی جارہی ہے، جب کہ ذاتی ظن وتخمین سے ثابت کیے جانے والے نظمِ قرآن کو حدیث کے مقابلہ میں 'اصل' کی حیثیت دی جارہی ہے۔ یقیناً مولانا کا یہ اصول تفسیر محلِ نظر ہے۔

۳۵۔ مجموعہ تفاسیر فراہی، ص ۳۷، ۳۹۔

۳۶۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، مترجم امین احسن اصلاحی، ص ۳۸، طبع دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ، ط ۱۹۹۰ء۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۴۵۱۔ ۳۸۔ تدبر قرآن، مقدمہ، ج۱ص ۱۳، ۱۴۔

۳۹۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، **کتاب المناقب، باب فی فضل الشنام والیمین**، حدیث ۳۹۵۴، مکتبۃ دارالسلام، ریاض، ۱۹۹۶ء۔ نیز دیکھیے: احمد بن حنبلؒ، 'مسند احمد' ج۵ص ۱۸۴، ۱۸۵، المکتب الاسلامی بیروت، س ن۔

۴۰۔ الاتقان، ج۱ص ۲۱۴۔

۴۱۔ مسلم، امام، مسلم بن حجاج، **صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل سورۃ الکھف وآیۃ الکرسی**، حدیث ۸۰۹، طبع دارالسلام ریاض، ۱۹۹۶ء۔

۴۲۔ **ایضاً، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل الفاتحۃ وخواتیم سورۃ البقرۃ**..... حدیث ۸۰۸۔

۴۳۔ الاتقان، ج۱ص ۲۲۰۔ ۴۴۔ ایضاً۔

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کی اردو مطبوعات

	کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
۱	معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۲۱۶	۲۵
۲	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۳۳۲	۱۰۰
۳	صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۳۸۸	۱۷۵
۴	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۲۴۰	۸۰
۵	اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۱۷۶	۴۰
۶	اسلام اور مشکلاتِ حیات	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۸۸	۸
۷	مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰
۸	مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۰۲	۲۰
۹	وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۹۲	۴۰
۱۰	آزادیٔ فکر ونظر اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۲۸	۴۰
۱۱	قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	۲۹۶	۷۰
۱۲	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	۲۰۰	۴۰
۱۳	ایمان وعمل کا قرآنی تصور	پروفیسر الطاف احمد اعظمی	۲۸۰	۲۵
۱۴	عہدِ نبوی کے غزوات وسرایا	ڈاکٹر رؤفہ اقبال	۲۴۷	۲۵
۱۵	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰
۱۶	شیئر بازار میں سرمایہ کاری	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۱۵۶	۴۵
۱۷	تصوّف- ایک تجزیاتی مطالعہ	پروفیسر عبیداللہ فراہی	۲۰۰	۲۵

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

بحث ونظر

صلحِ حدیبیہ اور فتحِ مکہ کا مطالعہ- امنِ عالم کے نقطۂ نظر سے

——— ڈاکٹر لطف الرحمٰن فاروقی

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب تیرہ سال تک اپنی قوم کی خیر خواہی میں انہی کے ہاتھوں ظلم وستم کا نشانہ بنے رہے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ بالآخر اہلِ یثرب کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت مدینہ طیبہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ مگر کفارِ قریش نے ان کو وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور ان کو مٹانے پر تلے رہے اور پے در پے ان پر جنگیں مسلط کیں۔ اس صورت حال میں ایک روز رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں عمرہ ادا فرمایا ہے۔ سورۂ فتح میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللّٰهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُؤُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِن دُونِ ذَلِكَ فَتْحاً قَرِيباً، هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللّٰهِ شَهِيداً۔ (الفتح:۲۷-۲۸)

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہوگے، اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے، اور تمہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کردے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔

ان آیات میں دو باتوں کو نمایاں طور پر بتایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنے رسول کو برحق اور سچا خواب دکھایا ہے کہ وہ پورے امن کے ساتھ بے خوف ہو کر مسجد حرام میں اپنے اصولِ دین کے مطابق داخل ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ اس خواب کو پورا ہونے سے پہلے فتحِ قریب عطا فرمادی۔ ساتھ ہی تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اپنے رسولؐ کو دینِ حق دے کر بھیجا ہے تا کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ ان حالات میں بظاہر رسول اللہ ﷺ کے اس خواب پر عمل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کیونکہ کفار قریش نے ہجرت کے بعد سے چھ سال تک مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا اور اس پوری مدت میں کسی بھی مسلمان کو انہوں نے حج یا عمرہ تک کے لیے حدودِ حرم کے قریب پھٹکنے نہ دیا تھا۔ مگر انبیاء کا خواب چونکہ سچا ہوتا ہے اس لیے آپؐ نے بلا تامل اپنا خواب صحابہ کرام کو سنا کر سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آس پاس کے قبائل میں بھی اعلانِ عام پہنچ گیا کہ ہم عمرہ کے لیے جا رہے ہیں جو ہمارے ساتھ چلنا چاہے وہ آجائے، چنانچہ ۱۴ سو صحابۂ کرام حضورؐ کی معیت میں عمرہ کے لیے روانہ ہوئے۔[۱]

ذی القعدہ ۶ھ کے آغاز میں یہ مبارک قافلہ مدینہ سے روانہ ہوا اور تقریباً ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ذوالحلیفہ پہنچ کر، جو آج کل بیر علی سے موسوم ہے، سب نے عمرے کا احرام باندھا۔ قربانی کے لیے ۷۰ اونٹ ان کے ہمراہ تھے جن کی گردنوں میں ھدی کی علامت کے طور پر قلادے پڑے ہوئے تھے۔ اسلحہ میں سے صرف ایک ایک تلوار رکھ لی گئی جس کی تمام زائرین حرم کو عرب کے معروف قائدے کے مطابق اجازت تھی، اس کے سوا کوئی سامانِ جنگ ساتھ نہ لیا گیا۔ یوں یہ قافلہ لبیک لبیک کی صدا بلند کرتا ہوا بیت اللہ کی طرف روانہ ہوا۔

ذی القعدہ کا مہینہ ان حرام مہینوں میں سے ایک تھا جو صدہا برس سے عرب میں حج و زیارت کے لیے محترم سمجھے جاتے تھے۔ عرب کے دستور کے مطابق اس مہینے میں جو قافلہ احرام باندھ کر حج یا عمرے کے لیے جا رہا ہو اسے روکنے کا کسی کو حق نہ تھا۔ حتّٰی کہ کسی قبیلے سے اس کی دشمنی بھی ہو تو عرب کے مسلمہ قوانین کی رو سے وہ اپنے علاقے سے اس کے گزرنے میں مانع نہ ہوتا تھا۔

مگر قریش کو جیسے ہی اس قافلے کی آمد کی اطلاع ملی انہوں نے اپنی جاہلی حمیت سے مغلوب ہوکر یہ فیصلہ کیا کہ کسی قیمت پر اس قافلہ کو اپنے شہر مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ وہ پوری تیاری کے ساتھ ذی طویٰ کے مقام پر پہنچ گئے اور خالد بن ولید کو آپؐ کا راستہ روکنے کے لیے دوسو سواروں کے ساتھ کراع النعیم کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ اطلاع پا کر آپؐ نے اشتعال اور جنگ وجدال سے گریز کرتے ہوئے راستہ بدلا اور ایک دشوار گزار راستہ سے سخت مشقت اٹھا کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے جو عین حرم کی سرحد پر واقع تھا۔ آج کل یہ مقام شمیسیہ کے نام سے موسوم ہے جو مکہ سے تقریباً ۱۳ میل کے فاصلہ پر ہے۔

مختلف قبائل کے سردار اور قریش کے ایلچی یہاں پہنچ کر آپؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کرتے رہے، مگر آپؐ نے سب کو یہ یقین دلایا کہ ہم عمرہ ادا کرنے کے علاوہ اور کسی غرض سے نہیں آئے۔ مگر قریش نے ایک سن کر نہ دی اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

ایلچیوں اور سفارت کاروں کی آمدورفت اور گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا۔ دریں اثنا قریش کے لوگ بار بار کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح صحابہ کرامؓ کو اشتعال دلا کر ان سے کوئی ایسا اقدام کرالیں جس سے لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے۔ مگر ہر مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی حکمت وفراست اور صحابہ کے صبر وتحمل نے ان کی ساری تدبیروں کو ناکام بنا دیا۔

ایک دفعہ ان کے چالیس پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور مسلمانوں کے پڑاؤ پر پتھر اور تیر برسانے لگے۔ اصحاب رسولؐ نے ان سب کو گرفتار کر کے حضورؐ کے سامنے پیش کر دیا، مگر آپؐ نے ان سب کو چھوڑ دیا۔ ایک اور موقع پر تنعیم کی طرف سے ۸۰ آدمیوں نے عین نمازِ فجر کے وقت آ کر اچانک چھاپا مارا۔ یہ لوگ بھی پکڑے گئے، مگر حضورؐ نے انہیں بھی رہا کر دیا۔ اس طرح حضورؐ کی حسن تدبیر سے قریش کی ہر چال اور تدبیر ناکام ہوتی چلی گئی۔

آخر کار حضورؐ نے خود اپنی طرف سے حضرت عثمان غنیؓ کو ایلچی بنا کر مکہ بھیجا،

تا کہ وہ سردارانِ قریش کو یہ پیغام پہنچادیں کہ مسلمان جنگ کے لیےنہیں، بلکہ زیارت کے لیے ہدی ساتھ لے کر آئے ہیں ،طواف اور قربانی کرکے واپس چلے جائیں گے ۔مگر وہ لوگ نہ مانے اور حضرت عثمانؓ کو مکہ ہی میں روک لیا۔اس دوران میں یہ خبر اڑگئی کہ حضرت عثمان ﷺ کو قتل کردیا گیا ہے اوران کے پاس نہ آنے سے مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ یہ خبر سچی ہے۔[۲]

اب معاملہ سفیر کے قتل تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کرکے اس بات پر بیعت لی کہ اب ہم یہاں سے مرتے دم تک پیچھے نہ ہٹیں گے ۔ چونکہ حضرت عثمانؓ اس موقع پر موجود نہ تھے اس لیے خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا دوسرا ہاتھ ان کی طرف سے بیعت کے لیے رکھا۔اس بیعت کی اہمیت کو اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اکرم سے مخاطب ہوکر یوں بیان کیا:

إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيْهِ أَجْراً عَظِيْماً (الفتح-۱۰)

جو لوگ تم سے بیعت کررہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کررہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہوگا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عن قریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

اس بابرکت بیعت کے بارے میں ایک اور مقام پر آپؐ کو مخاطب کر کے جو ارشاد فرمایا گیا، اس سے آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کی عظمت اور مستقبل کے امکانات پر روشنی پڑتی ہے۔ ارشاد ہوا:

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِيْنَةَ

اللہ مومنوں سے خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کررہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم تھا۔اس لیے

عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيْباً وَمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً، وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطاً مُّسْتَقِيْماً، وَأُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْراً، وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيّاً وَلَا نَصِيْراً سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيْلاً وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْراً (الفتح:۱۸-۲۳)

اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی، ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سا مالِ غنیمت انہیں عطا کردیا جسے وہ حاصل کرلیں گے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ اللہ تم سے بکثرت اموال غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کردی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیے تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔ اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے ہو اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ کافر لوگ اگر اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے، حالانکہ وہ ان پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر غلط تھی اور وہ واپس آ گئے۔ ادھر قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد بھی صلح کی بات چیت کرنے کے لیے آیا۔ اب قریش اس موقف سے دست بردار ہوگئے کہ حضورؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو سرے سے مکہ میں داخل ہی نہ ہونے دیں گے۔ البتہ اپنی ناک

بچانے کے لیے ان کو صرف یہ اصرار تھا کہ آپؐ عمرہ کے لیے آ سکتے ہیں۔ طویل گفت وشنید کے بعد جو صلح نامہ لکھا گیا وہ امن پسند لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ امام زہریؒ کے مطابق اس کی تفصیل یوں ہے:

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو بلایا اور ارشاد فرمایا ''لکھو'' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اس پر سہیل نے کہا: میں یہ نہیں جانتا، بلکہ لکھو باسمک اللھم (اے اللہ تیرے نام سے) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: باسمک اللھم ہی لکھو تو حضرت علیؓ نے یہی لکھ دیا اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لکھو: **ھذا ما صالح علیه محمد رسول الله سهیل بن عمرو** (یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ نے سہیل بن عمر سے صلح کی) سہیل نے کہا: اگر میں اس بات کا اقرار کرتا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں تو آپؐ سے جنگ کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لکھو

ھذا ما صالح علیه محمد بن عبدالله سهیل بن عمرو اصطلحا علی وضع الحرب عن الناس عشر سنین یأمنُ فیهن الناس، ویکفّ بعضهم عن بعض، علی انه من آتی محمداً من قریش بغیر اذن ولیّه ردّه علیهم ومن جاء قریشاً ممن مع محمد لم یردُّوه علیه، وان بیننا عیبة مکفوفة، وانه لا إرسلال ولا إغلال، وانّه من احب ان یدخل فی عقد محمد وعهده دخل فیه،

یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد (ص) بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے صلح کی، دونوں نے اتفاق کرلیا کہ دس سال تک جنگ بند رہے گی۔ ان دس سالوں میں لوگ امن کی زندگی بسر کریں گے اور وہ ایک دوسرے سے ہاتھ روکے رہیں گے۔ شرط یہ ہے کہ قریش کا جو آدمی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد (ص) کے پاس آئے گا محمد (ص) اسے قریش کو لوٹا دیں گے اور محمد کے ساتھیوں میں جو آدمی قریش کے پاس آئے گا قریش اسے محمد (ص) کو واپس نہ کریں گے۔ نیز یہ کہ دونوں کی عداوتیں اندرون خانہ ہی رہیں گی، انہیں ظاہر نہ کیا جائے گا۔ بدعہدی اور خیانت نہ کی جائے

ومن احب ان یدخل فی عقد قریش وعھدھم دخل فیه ۔ ۳

گی اور یہ کہ جو چاہے کہ محمد (ص) کے عہد میں داخل ہو وہ اس میں داخل ہو جائے اور جو چاہے کہ قریش کے عقد میں داخل ہو وہ ان کے عقد میں داخل ہو جائے۔

آپؐ نے اس صلح نامہ پر کچھ مسلمانوں اور کچھ مشرکوں کی شہادتیں کرائیں جن کے نام یہ ہیں: ۱۔ ابو بکر صدیقؓ ۲۔ عمر بن خطابؓ ۳۔ عبد الرحمٰنؓ بن عوف ۴۔ عبد اللہؓ بن سہیل بن عمرو ۵۔ سعدؓ بن ابی وقاص ۶۔ محمدؐ بن مسلمہ ۷۔ مکرز بن حفص (اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) ۸۔ علیؓ بن ابی طالب۔ یہ تحریر حضرت علیؓ نے لکھی تھی۔

یہ بھی طے ہوا کہ محمد ﷺ اس سال واپس جائیں گے اور آئندہ سال وہ عمرے کے لیے آ کر تین دن مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں، بشرطیکہ پرتلوں میں صرف ایک تلوار لے آئیں اور دوسرا کوئی سامانِ حرب ساتھ نہ لائیں۔ ان تین دنوں میں اہلِ مکہ ان کے لیے شہر خالی کر دیں گے، تاکہ کسی تصادم کی نوبت نہ آئے۔ واپس جاتے ہوئے وہ یہاں کے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

صلح نامۂ حدیبیہ: حضرت علیؓ کی زبانی

طویل گفت وشنید کے بعد رسول اللہ ﷺ اور کفار مکہ کے نام زد کردہ نمائندے سہیل بن عمرو کے درمیان معاہدہ ہوا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا۔ ابن اسحاقؒ نے صلح نامہ کے کاتب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبانی ایک جامع روایت نقل کی ہے جس سے صلح سے متعلق تمام امور پر روشنی پڑتی ہے، وہ یوں ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صلح کے تصفیے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مجھے طلب فرمایا اور کہا: معاہدہ لکھو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"۔ سہیل نے کہا: میں اس جملے کو نہیں جانتا، البتہ یوں لکھو "باسمک اللھم" رسول اللہ نے مجھ سے کہا: یہی لکھ دو۔ میں نے یہی لکھ دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: آگے لکھو "یہ معاہدہ جس پر محمد رسول اللہؐ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے"۔ اس پر سہیل نے کہا: اگر ہم اس بات کو مانتے

ہوتے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں تو پھر کیوں لڑتے، اس کے بجائے آپؐ اپنا محض نام اور اپنے والد کا نام لکھوایئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کہا: اچھا لکھو" یہ وہ شرائط ہیں جن پر محمد بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے۔ آج سے دس سال تک ہم باہم کوئی لڑائی نہ لڑیں گے۔ اس مدت میں ہر شخص مامون ہوگا۔ کوئی کسی پر دست درازی نہیں کرے گا۔ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر رسول اللہ ﷺ کے پاس آجائے گا۔ رسول اللہ ﷺ اسے اس کے اولیا کے پاس واپس بھیج دیں گے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ہمرائیوں میں سے اگر کوئی قریش کے پاس چلا جائے گا تو وہ اسے آپؐ کے پاس واپس نہ بھیجیں گے۔ اب ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہیں رہی، نہ تلواریں نکلیں گی اور نہ تیر اندازی اور سنگ اندازی ہوگی۔ جس کا جی چاہے وہ محمد ﷺ کے ساتھ ان کے عہد و پیمان میں داخل ہوجائے اور جس کا جی چاہے وہ قریش کے ساتھ ہوجائے"۔

اس شرط کو سنتے ہی خزاعہ اٹھے اور انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ ان کے عہد میں شامل ہوتے ہیں۔ بنو بکر اٹھے اور انہوں نے کہا کہ ہم قریش کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لکھا گیا کہ اس سال آپؐ واپس چلے جائیں گے اور مکہ کے اندر نہیں آئیں گے۔ آئندہ سال ہم خود آپؐ کے لیے مکہ چھوڑ دیں گے۔ آپؐ اپنے صحابہ کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوں اور تین دن قیام کریں۔ رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو اس عہد نامے کے لکھوانے میں مصروف تھے کہ اتنے میں ابو جندلؓ بن سہیل بن عمرو بیڑیاں پہنے رسول اللہ ﷺ کے پاس آپہنچے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح کا یقین تھا اور وہ آپؐ کے ساتھ عمرہ کرنے مدینہ سے نکلے تھے، مگر اب جب انہوں نے دیکھا کہ اس نہج پر صلح ہو رہی ہے اور ہم بے نیل و مرام واپس جائیں گے اور خود رسول اللہ ﷺ قریش کی بات مان کر ان کی منشا کے مطابق صلح کر رہے ہیں تو مسلمانوں کے دلوں میں اس قدر سخت رنج و تعصب پیدا ہوا کہ قریب تھا کہ وہ ہلاک ہوجائیں۔ سہیل نے جب ابو جندلؓ کو دیکھا تو اس نے بڑھ کر ان کے منہ پر تھپڑ مارا اور گردن تھام لی اور پھر

رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کے آنے سے پہلے میرے اور تمہارے درمیان معاملہ طے ہو چکا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: صحیح ہے۔ اب سہیل اس کی گردن پکڑ کر اسے دھکا دیتا اور کھینچتا ہوا قریش کی طرف پلٹانے لگا۔ ابو جندلؓ نے انتہائی بلند آواز سے چلانا شروع کر دیا اور کہا: اے مسلمانو! مجھے مشرکین کے پاس لوٹایا جا رہا ہے۔ میرے ایمان کی وجہ سے مجھے اس مصیبت میں ڈالا جا رہا ہے اس جملے نے مسلمانوں کے زخمی دلوں پر اور نمک پاشی کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو جندلؓ سے کہا کہ اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہارے جیسے دوسرے مجبور لوگوں کے لیے جلد مصیبت سے نکالنے کی سبیل کرنے والا ہے۔ چونکہ ہم نے اہل مکہ سے صلح کر کے معاہدہ کر لیا ہے اور اس کے ایفا کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے اس لیے اب ہم ان کے ساتھ بے وفائی نہیں کریں گے۔ عمرؓ اٹھے اور ابو جندل کے پاس جا کر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ان سے کہتے تھے: ''صبر کرو، یہ قریش مشرک ہیں، ان کی جان کتے کے برابر ہے''۔ اس کے ساتھ وہ اپنی تلوار کا قبضہ ان کے نزدیک کرتے رہے۔ خود عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ وہ تلوار لے لیں اور اس سے اپنے باپ کا خاتمہ کر دیں، مگر انہوں نے گوارا نہیں کیا کہ اپنے باپ کو خود مار دیں۔ جب صلح نامے کی تحریر مکمل ہو گئی تو بعض مسلمان اور بعض مشرک اس پر شاہد ہوئے۔ گواہوں میں ابو بکرؓ، عمرؓ، عبد الرحمٰن بن عوفؓ، عبداللہؓ بن سہیل بن عمرو، سعدؓ بن ابی وقاص، قبیلہ عبدالاشہل کے محمود بن مسلمہ، بنی عامر بن لوئی کا مکرز بن حفص بن ابوالاخیف جو مشرک تھا اور علیؓ بن ابی طالب تھے۔ علیؓ نے اس صلح نامہ کو تحریر کیا۔''[۴]

یہ تھی صلح حدیبیہ کے بارے میں حضرت علیؓ کی روایت۔ اس معاہدہ میں طے پانے والے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ دس سال کے لیے جنگ بندی ہوگی۔ معاہدہ میں شامل ہر فرد مامون ہوگا۔ کوئی کسی پر دست درازی نہیں کرے گا۔

۲۔ جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر رسول اللہ ﷺ کے پاس جائے گا آپؐ

اسے اس کے اولیا کے پاس واپس بھیج دیں گے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہیوں میں سے اگر کوئی قریش کے پاس چلا جائے گا تو وہ اسے آپؐ کے پاس واپس نہیں بھیجیں گے۔

۳۔ قبائل کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہیں تو عہد و پیمان میں قریش کے ساتھ شامل ہو جائیں یا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل جائیں۔

۴۔ اس سال مسلمان عمرہ ادا کیے بغیر واپس چلے جائیں گے۔ اگلے سال قریش مکہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیں گے تو رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں گے۔

۵۔ آپؐ تین دن سے زائد مکہ میں قیام نہیں کریں گے۔

۶۔ آپؐ اور آپؐ کے اصحاب نیام میں بند تلواروں کے علاوہ کوئی جنگی ہتھیار ساتھ نہیں لائیں گے۔

صلحِ حدیبیہ پر حضرت عمرؓ کا ردعمل

اس معاہدہ پر سب سے سخت ردعمل حضرت عمرؓ نے ظاہر کیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر عرض کیا: یا رسول اللہ، کیا ہم سچے دین پر اور کافر جھوٹے دین پر نہیں ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ پھر انہوں نے کہا: کیا ہم میں سے جو مارا جائے وہ جنت میں نہیں جائے گا اور ان میں سے جو مارے جائیں وہ جہنم میں نہیں جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: پھر کیوں ہم دین پر دھبہ لگائیں اور لوٹ جائیں جب کہ ابھی اللہ تعالیٰ نے ہمارا اور ان کا فیصلہ نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ **یا ابن الخطابانی رسول الله ولن یضیّعنی الله ابدا** (اے خطاب کے بیٹے! میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ مجھ کو کبھی تباہ نہیں کرے گا)۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ چلے گئے، مگر غصہ کے مارے صبر نہ ہو سکا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس جا کر ان سے کہا ''اے ابوبکرؓ! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟ ابوبکرؓ نے کہا: کیوں نہیں۔ انہوں نے

کہا: پھر کیوں ہم اپنے دین کا نقصان کریں اور لوٹ جائیں جب کہ ابھی ہمارا اور ان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا۔ ابوبکرؓ نے کہا ''یا ابن الخطاب انه رسول الله ﷺ ولن يضيّعه الله ابدا '' (اے خطاب کے بیٹے، آپؐ اللہ کے رسول ہیں، اللہ ان کو کبھی تباہ نہیں کرے گا)۔ پھر رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی جس میں فتح کا ذکر تھا اور اس سے مراد فتحِ مکہ ہے۔ امام زہری نے کہا: رسول اللہ ﷺ حدیبیہ سے واپس آتے ہوئے جب مکہ اور مدینہ کے درمیان پہنچے تو ان پر سورۂ فتح نازل ہوئی ۵ جس میں یہ خوش خبری دی گئی:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُّبِيْناً لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطاً مُّسْتَقِيْماً وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْراً عَزِيْزاً (الفتح:۱-۳)

اے نبی، ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کردی، تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کردے اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست نصرت بخشے۔

آپؐ نے حضرت عمرؓ کو بلا بھیجا اور یہ سورہ پڑھائی۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ، یہ صلح ہمارے لیے فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، تب وہ خوش ہوگئے اور لوٹ آئے۔ ۶

بظاہر دیکھنے میں یہ ایک پسپائی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں جو حکمت پوشیدہ کررکھی تھی وہ مکہ کی فتح عظیم کی شکل میں نمودار ہوئی۔ صحابہ کرامؓ کی مایوسی کو اللہ تعالیٰ نے ایک خوش خبری میں تبدیل کردیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے موقع پر سورۂ فتح تلاوت کرتے رہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے:

عن عبد الله بن مغفل رضی الله عنه قال رايت رسول الله ﷺ يوم فتح مكة على ناقته يقرأ سورة الفتح قال فقرأ ابن مغفل ورجع، قال معاوية لو لا الناسُ لاخذتُ لكم بذلک الذی ذكره ابن مغفل عن النبی ﷺ۔ ۷

عبداللہ بن مغفلؓ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے دن اپنی اونٹنی پر سوار سورۃ الفتح پڑھتے ہوئے دیکھا اور انہوں نے یعنی ابن مغفلؓ نے آواز دہراتے ہوئے پڑھا۔ معاویہ نے کہا اگر لوگ نہ ہوتے تو میں بھی ویسی ہی قراءت شروع کرتا جیسے ابن مغفل نے نبی ﷺ سے ذکر کیا۔

صبر و برداشت کا ثمر

صلح حدیبیہ بظاہر ایک طاقتور ظالم قوت کے ساتھ مظلوم اور لاچار کی صلح نظر آتی ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے صبر و تحمل، حکمت و فراست اور اللہ پر کامل یقین نے اس کے اندر سے خیر کی راہ نکال لی۔

جس وقت معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں اس وقت سہیل بن عمرو کے اپنے بیٹے ابو جندلؓ، جو مسلمان ہو چکے تھے اور کفار مکہ نے ان کو قید کر رکھا تھا، کسی نہ کسی طرح بھاگ کر حضورؐ کے کیمپ میں آ پہنچے۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں اور جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ انہوں نے آپؐ سے فریاد کی کہ مجھے اس حبسِ بے جا سے نجات دلائی جائے۔ صحابہ کرامؓ کے لیے بھی ان کے یہ حالات دیکھ کر ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ مگر سہیل بن عمرو نے کہا کہ صلح نامہ کی تحریر چاہے مکمل نہ ہوئی ہو مگر شرائط تو ہمارے اور آپ کے درمیان میں طے ہو چکی ہیں، اس لیے اس لڑکے کو میرے حوالے کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی حجت تسلیم کی اور ابو جندلؓ کو ان کے باپ کے حوالے کر دیا اور وہ ابو جندلؓ پر تشدد کرتے ہوئے قریش کی طرف لے گیا۔ ادھر ابو جندلؓ نے بلند آواز سے چیخنا شروع کر دیا کہ اے مسلمانوں کے گروہ! کیا میں مشرکوں کی طرف واپس جا سکتا ہوں جو میرے دین کو برباد کر دیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابو جندل! صبر سے کام لو اور ثواب کا خیال رکھو۔ اللہ تمہارے لیے اور ان کمزور مسلمانوں کے لیے جو تمہارے ساتھ ہیں، کشادگی کا راستہ پیدا کر دے گا۔ ہم نے اپنے اور اس قوم کے درمیان صلح کا معاہدہ کر لیا ہے اور اس پر ہم نے بھی اور انہوں نے بھی اللہ سے عہد کر لیا ہے، ہم یہ عہد کسی طرح بھی توڑنے کے لیے تیار نہیں''۔[۸]

ظالمانہ معاہدہ سے ظالم خود دست بردار ہوتا ہے

معاہدۂ حدیبیہ کو قریش اپنی کامیابی اور مسلمانوں کی ناکامی سمجھتے تھے، مگر اللہ نے اس سے مختلف نتیجہ برآمد کیا۔ قریش نے اس کو اپنی جیت سمجھا کہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ

جانے والوں کو واپس کر دیا جائے گا اور مدینہ سے بھاگ کر مکہ جانے والوں کو واپس نہ کیا جائے گا، مگر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ یہ معاملہ بھی قریش پر الٹا پڑا۔

صلح کے کچھ دنوں بعد مکہ سے ایک مسلمان ابوبصیر، جنہیں مکہ میں روک لیا گیا تھا، قریش کی قید سے بھاگ نکلے اور مدینہ پہنچ گئے۔ قریش نے ان کی واپسی کے لیے دو آدمیوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔ یہ دونوں قریش کا مکتوب لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے۔ آپ ﷺ نے ابوبصیر سے فرمایا: ''ابوبصیر! ہم نے قوم (قریش) سے جو عہد کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے دین میں عہد شکنی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ دوسرے کم زور مسلمانوں کے لیے کشادگی کی کوئی راہ پیدا کر دے گا اور کوئی نہ کوئی مفر نکلے گا، اس لیے تم اپنی قوم کے پاس واپس چلے جاؤ''۔ ابوبصیرؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ، کیا آپؐ مجھے مشرکوں کے پاس واپس بھیج رہے جو میرا دین برباد کر دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابوبصیر! تم واپس جاؤ، اللہ تعالیٰ عن قریب تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ دوسرے کم زور مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی کشادگی اور بچاؤ کی راہ نکالے گا''۔ رسول اللہ ﷺ کا جواب سن کر انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ان کے ساتھ ہو لیے۔ یہاں تک کہ جب وہ ذوالحلیفہ پہنچے تو بہانہ بنا کر ان دو میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ نکلا۔

پھر ابوبصیر یہاں سے نکل کر بحر احمر کے کنارے واقع جزیرۃ العرب کی مغربی ساحلی شاہراہ پر واقع عیص کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے قریش تجارت کے لیے شام جایا کرتے تھے۔ مکہ کے مجبور و مظلوم مسلمانوں کو بھی یہ خبر پہنچ گئی اور وہ بھی ایک ایک کر کے عیص میں ابوبصیر سے آ کر ملنے لگے۔ اس طرح ستر افراد وہاں جمع ہو گئے اور انہوں نے قریش کے قافلوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ قریش کے جس فرد کو بھی پا لیتے اس کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑتے اور جو بھی قافلہ ان کے پاس سے گزرتا اس کو لوٹ لیتے۔

بالآخر عاجز آ کر قریش نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنی قرابت داری کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ ان مسلمانوں کو جو انہیں تنگ کیے ہوئے ہیں، اپنے پاس

بلا کر جگہ دیں ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ آپؐ نے انہیں مدینہ واپس بلا لیا۔[9]

اس طرح حدیبیہ کے معاہدے کی یہ ظالمانہ شرط ظالموں کے اپنے ہاتھوں ساقط ہوگئی۔

صلح حدیبیہ کے دوررس نتائج

دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد پیش آیا جس کو اللہ تعالیٰ نے فتح قریب سے تعبیر کیا۔ اس سلسلہ میں ابن ہشام زہری کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں اتنی بڑی کوئی فتح حاصل نہیں ہوئی۔ جہاں بھی ایک دوسرے سے دوچار ہوتے، جنگ ہوکر رہتی تھی۔ لیکن جب یہ مصالحت ہوئی تو جنگ روک دی گئی، لوگ ایک دوسرے سے مامون ہوگئے اور میل ملاقات کرنے لگے۔ باہم گفت وشنید اور تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص اسلام کے بارے میں بات کرتا اور اس کی سمجھ میں کوئی چیز آجاتی تو وہ اسلام میں داخل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی جو تعداد تھی اس کے مساوی بلکہ اس سے زیادہ لوگ ان دو برسوں میں داخلِ اسلام ہوئے۔

ابن ہشام نے کہا: زہری کے قول کے لیے دلیل یہ ہے کہ بقول جابرؓ بن عبداللہ صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ ایک ہزار چار سو آدمی لے کر نکلے تھے، مگر آپؐ دو سال کے بعد مکہ فتح کرنے نکلے تو آپ کے ساتھ دس ہزار جاں باز تھے۔[10]

فتحِ مکہ: جنگ برائے امن کے لازوال نقوش

ہجرت کے بعد کے طویل آٹھ سالوں تک قریشِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ کو چین سے زندگی گزارنے نہ دی۔ جب اللہ نے ان پر فتح حاصل کرنے کا موقع دیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ رواداری کا جو سلوک فرمایا وہ تاریخ کا ایک جگمگاتا ہوا سنہرا باب ہے۔ دشمنوں کے ساتھ درگزر سے پیش آنے کی یہ مثال قیامت تک فاتحین کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

سنہ ۶ ھ میں کفارِ مکہ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر جو معاہدۂ امن طے پایا تھا اس میں ایک شرط یہ تھی کہ جو شخص یا قبیلہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں شامل ہونا چاہے شامل ہوجائے اور جو قریش کے عہد میں شامل ہونا چاہے ان کے ساتھ شامل ہوجائے۔ اس شرط کے نتیجے میں قبیلۂ بنو بکر قریش کے عہد میں اور قبیلۂ بنو خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں شامل ہوگئے۔ مگر قریش نے عہد شکنی کی اور قبیلۂ بنو خزاعہ کے قتل میں قبیلۂ بنو بکر کی حمایت کی۔ رسول اللہ ﷺ کو جب قریش کی اس عہد شکنی کی خبر ہوئی تو آپؐ نے قریش پر فوج کشی کا عزم فرمایا۔ قریش نے یہ مہم روکنے کی کوشش کی، مگر آپؐ اپنے عزم پر قائم رہے اور مکہ پر فوج کشی کی، جو فتح مکہ کا سبب بنی۔[۱۱]

فتح مکہ کے بعد

آج تمام مجرم مفتوح حالت میں ہاتھ باندھے، سر جھکائے آپؐ کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان مجرمین میں ہند بنت عتبہ بھی تھی جس نے جنگ احد کے موقع پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ شہدائے کرام کے جسموں کے اعضاء کے ٹکڑے ٹکڑے کیے، مقتول شہدا کے کان، ناک کاٹے، یہاں تک کہ ان کے کٹے ہوئے ناک، بازو کا ہار بنایا اور خود اپنے کان کی بالیاں جبیر بن مطعم کے غلام وحشی کو انعام کے طور پر دے دیں، جس نے حضرت حمزہؓ کو بے دردی سے شہید کیا تھا نیز اس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چیر کر نکالا اور چباڈالا۔ اس کے بعد اس نے ایک بلند چوٹی پر چڑھ کر انتہائی بلند آواز میں اپنے وہ اشعار پڑھے جو اس نے اپنے لشکر کی فتح اور صحابہؓ کی شہادت کی خوشی میں کہے تھے۔[۱۲]

اب یہ تمام مجرمین منتظر تھے کہ ان کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کیا جائے گا یا اس سے بھی دردناک! مگر آپ ﷺ نے ان کے ساتھ درگزر کا جو سلوک فرمایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس موقع پر آپؐ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ انسانی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر طبقہ کے رہنماؤں کے لیے قیامت تک کے لیے قابل تقلید ہے۔ ایک چشم دید گواہ کی زبانی فتح مکہ کی تفصیل یوں ہے:

اہلِ مکہ سے خطاب

حضرت قتادہ السدوسی اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور آپؐ نے فرمایا: ''ایک اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں۔ وہ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور صرف اس نے مشرکین کی جماعت کو شکست دے کر بھگا دیا۔ سن لو، سوائے کعبہ کی خدمت اور حجاج کی آب رسانی کے، تمام مفاخر، تمام انتقاماتِ خون بہائے قدیم اور تمام خوں بہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ جو شخص خطا سے مارا جائے اس کے عوض وہ دیت مقرر کی جاتی ہے جو کوڑے یا ڈنڈے سے عمداً مارنے کی دیت ہے۔ اور یہ دیت واجب ہے جس سے کوئی مفر نہیں اور وہ یہ ہے کہ چالیس حاملہ اونٹنیاں دی جائیں۔ اے قریش! اللہ نے نخوتِ جاہلیت کو تم سے دور کر دیا ہے۔ تم کو اسے قطعی ترک کر دینا چاہیے۔ تمام انسانوں کے باپ آدمؑ تھے اور آدمؑ کو اللہ نے مٹی سے بنایا ہے''۔ اس کے بعد آپؐ نے کلام اللہ کی یہ پوری آیت تلاوت فرمائی ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ ۔الحجرات-۱۳ (اے لوگو، ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو خاندانوں اور قبائل میں تقسیم کیا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہے) اے قریش، اے اہلِ مکہ! جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ انہوں نے یک زبان ہو کر کہا: ''آپؐ اچھا ہی سلوک کریں گے۔ کیونکہ آپؐ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں''۔ آپؐ نے فرمایا: **اذھبو فانتم الطلقاء** (اچھا جاؤ تم سب آزاد ہو)

رسول اللہ ﷺ نے تمام اہل مکہ کو آزاد کیا، حالانکہ بزور شمشیر اللہ نے ان کو آپؐ کے لیے مسخّر کیا تھا اور وہ بمنزلہ فئے کے تھے۔ اسی وجہ سے اہل مکہ کو ''طلقاء''

(آزاد شدہ) کہا جاتا ہے۔ اب تمام لوگ اسلام لانے اور رسول اللہ ﷺ کی بیعت کرنے مکہ میں جمع ہوئے۔ عمرؓ بن خطاب آپؐ سے منبر پر ایک درجہ نیچے بیٹھے تھے، یہی لوگوں سے بیعت کراتے تھے اور اس اقرار پر کہ وہ حتی المقدور اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرماں برداری کریں گے، بیعت کرتے تھے۔

مردوں کی بیعت سے فارغ ہوکر آپؐ نے عورتوں سے بیعت لینا شروع کی۔ قریش کی عورتیں بھی بیعت کے لیے آئیں۔ ان میں ہند بنت عتبہ بھی تھی۔ اس نے اپنی اس حرکت کی وجہ سے جو حمزہؓ کے ساتھ احد میں کی تھی، چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا اور اپنی شکل چھپا رکھی تھی۔ اپنے اس جرم کی وجہ سے اس کو خوف تھا کہ رسول اللہ ﷺ اسے گرفتار کرلیں گے۔

جب سب عورتیں آپؐ کے پاس بیعت کے لیے آئیں تو آپؐ نے ان سے فرمایا: اس اقرار کے ساتھ میری بیعت کرو کہ اللہ واحد کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ گی۔ ہند نے کہا: ''آپؐ ہم سے ایسی بات کا اقرار لے رہے ہیں جس کا اقرار آپ نے مردوں سے نہیں لیا، مگر ہم اس کے لیے تیار ہیں''۔ رسول اللہ صلی اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اور اس بات کا عہد کرو کہ چوری نہ کروگی''۔ ہند نے کہا: ''ابوسفیان کے مال سے البتہ تھوڑا بہت جو مجھے مل جاتا تھا، میں لے لیتی تھی، میں نہیں جانتی کہ وہ میرے لیے جائز ہے یا ناجائز''۔ اس پر ابوسفیان نے جو وہاں موجود تھے کہا: ''اب سے پہلے جو کچھ تم نے اس میں سے لیا ہے وہ تمہارے لیے حلال ہے''۔ اب رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم ہند بنت عتبہ ہو''؟ اس نے کہا: ہاں میں ہند بنت عتبہ ہوں۔ آپؐ میری گزشتہ خطائیں معاف فرمادیں۔ اللہ آپ کی خطائیں معاف فرمائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اور یہ اقرار کرو کہ زنا نہ کروگی''۔ ہند نے کہا: ''یا رسول اللہ، کیا شریف خاتون زنا کرتی ہے''؟ آپؐ نے فرمایا: ''اور یہ اقرار کرو کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی''۔ ہند نے کہا: ''ہم نے چھوٹوں کو پال کر بڑا کیا تھا آپ ہی نے بدر میں ان کو قتل کردیا۔ اب آپ

جانیں اور وہ‘‘ اس جواب پر عمرؓ بن خطاب اس قدر ہنسے کہ بے قابو ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ’’اور یہ اقرار کرو کہ کسی پر بہتان نہ لگاؤ گی‘‘۔ ہند نے کہا: ’’بخدا بہتان بہت ہی بری اور ذلیل بات ہے اور بعض لوگوں سے درگزر کر دینا زیادہ فائدہ مند ہوا کرتا ہے‘‘۔ آپؐ نے فرمایا: ’’اور اقرار کرو کہ میرے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو گی‘‘۔ ہند نے کہا: ’’ہم یہاں اس لیے نہیں آئے کہ کسی اچھی بات کے لیے آپؐ کے حکم کی خلاف ورزی کریں‘‘۔ اب رسول اللہ ﷺ نے عمرؓ سے فرمایا: ’’ان سے بیعت لے لو‘‘، اور آپؐ نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ عمرؓ نے ان سے بیعت لے لی۔

خود رسول اللہ ﷺ سوائے ان عورتوں کے جن کو اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کیا تھا، یا جو آپؐ کی محرم تھیں، دوسری کسی غیر عورت سے مصافحہ نہ کرتے تھے اور نہ ہاتھ لگاتے تھے اور نہ کوئی غیر عورت آپؐ کو چھوتی تھی۔

ابان بن صالح سے مروی ہے کہ عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ پانی سے بھرا ہوا ایک برتن آپؐ کے سامنے رکھا ہوتا تھا۔ جب آپؐ ان سے اقرار کرواتے تو آپؐ اپنا ہاتھ پانی میں ڈالتے اور نکال لیتے، پھر عورتیں اس پانی میں ہاتھ ڈالتیں۔ پھر آپ فرماتے: جاؤ میں نے تم سے بیعت کر لی‘‘۔[۱۳]

یہ تھی دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے باوجود درگزر اور رحمت کا سلوک جس کی مثال تاریخ انسانیت میں مفقود ہے۔ ایک دشمن عورت کے ساتھ آپؐ کا مکالمہ بھی آنے والے زمانہ کے انسانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔

کعبۃ اللہ کی عظمت کی بحالی

فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے مکہ کی اس عظمت کو قیامت تک کے لیے بحال فرمایا جو اپنا مقام کھو چکی تھی۔ اس موقع پر آپؐ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس سے تا قیامت انسانیت کو رہنمائی ملتی رہے گی۔ آپؐ نے فرمایا:

یاایّھا الناسُ ! انّ اللہ حرّم مکّۃ یوم خلق السمٰوٰت والارض فھی حرام من حرام الٰی یوم القیامۃ فلا یحلُّ لامرئ یومن باللہ والیوم الآخر، ان یسفک فیھا دما ولا یعضد فیھا شجرا. لم تحلل لا حد کان قبلی ولا تحلّ لا حد یکون بعدی ، ولم تحلل لی الاّ ھٰذہ الساعۃ غضبا علی اھلھا، اَلا ، ثم قد رجعت کحرمتھا بالامس ، فلیبلغ الشاھد منکم الغائب، فمن قال لکم ان رسول اللہ (قد)قاتل فیھا فقولوا، انَّ اللہ قد اَحلّھا لرسولہ ولم یحللھا لکم، یا معشر خزاعۃ ارفعوا ایدیکم عن القتل فلقد کثر القتل ان نفع، لقد قتلتم قتیلا لاُدیـنَّہ فمن قُتِل بعد مقامی ھٰذا فاھلہ بخیر النظرین ان شاء وا فدم قاتلہ ، وان شاء وا فعقلہ . [۱۴]

اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے جس دن زمین و آسمان پیدا کیے، اسی دن مکہ کو حرمت کی جگہ قرار دیا، پس وہ اس وقت سے برابر حرمت کی جگہ چلا آ رہا ہے اور قیامت تک اسی طرح محرم رہے گا، لہٰذا کسی بھی ایسے آدمی کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، یہ بات جائز نہیں کہ مکہ میں کسی کا خون بہائے یا اس کا کوئی درخت کاٹے، مجھ سے پہلے کسی بھی شخص کے لیے مکہ حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد آنے والے کسی شخص کے لیے حلال ہوگا، میرے لیے بھی حلال نہیں ہوا، ہاں صرف اس وقت کے لیے محض اس وجہ سے حلال کر دیا گیا کہ اہل مکہ پر اللہ کو اظہار غضب مقصود تھا، سن لو! اس وقت کے بعد اس کی حرمت کل کی طرح پھر لوٹ آئی۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ جو بھی یہاں موجود ہے اور میری یہ بات سن رہا ہے، وہ حقیقت کو ہر اس شخص تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔ پس تم سے جو شخص یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں قتال کیا تھا اس سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے رسولؐ کے لیے اسے حلال کیا تھا، تمہارے لیے حلال نہیں کیا۔ اے گروہ خزاعہ اب قتل سے اپنے ہاتھ اٹھا لو، قتل بہت ہو چکا ہے، اس میں کوئی نفع نہیں۔ تم نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے، میں اس کی دیت دوں گا۔ میرے اس قیام کے بعد جو قتل کیا جائے تو مقتول کے ورثاء کو دو چیزوں میں اختیار ہوگا اگر وہ چاہیں تو قصاص لے لیں اور چاہیں تو خون بہا لے لیں۔

خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے بنوخزاعہ کے قتل ہوئے شخص کا خون بہا ادا فرمایا۔ ۱۵

یومِ فتح یومِ وفا ہے

خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کے بعد آپؐ نے خانۂ کعبہ کا طواف فرمایا۔ طواف ختم کرنے کے بعد عثمان بن طلحہ کو بلایا اور ان سے کعبہ کی کنجی لے لی اور دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ دروازہ کھولا گیا تو آپؐ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور وہاں اپنے آباء و اجداد کی تصویریں دیکھیں۔ آپؐ نے تصویروں کو مٹانے کا حکم دیا۔ پھر آپؐ نے دروازے کے سامنے دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔

خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کرانے کے بعد آپؐ مسجد میں بیٹھ گئے اور حضرت علیؓ آپؐ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ کنجی ان کے ہاتھ میں تھی۔ آپؐ نے دریافت کیا: عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟ انہیں بلایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا ''**ھاک مفتاحک یا عثمان، الیوم یوم برّ و وفاء**'' (اے عثمان، یہ لو اپنی کنجی۔ آج نیکی اور وفا کا دن ہے)۔

حضرت عثمان بن طلحہؓ اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں: ''ہم زمانۂ جاہلیت میں پیر اور جمعرات کو کعبۂ مشرفہ کو کھولتے تھے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپؐ لوگوں کے ہمراہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتے تھے، اس وقت میں نے آپ کو برا بھلا کہا اور سختی سے پیش آیا، لیکن آپؐ نے حلم و بردباری اختیار کی اور فرمایا: ''اے عثمان شاید تو دیکھے گا کہ ایک دن یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا دوں گا''۔ میں نے کہا! تو اس دن قریش ہلاک ہو چکے ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا! نہیں، بلکہ یہ اس دن عزت مند اور آباد ہوں گے۔ پھر آپؐ کعبہ میں داخل ہو گئے۔ میرے دل میں یہ بات اٹک کر رہ گئی اور میں اس وقت سمجھ گیا کہ یہ کام اسی طرح ہوگا جیسے آپؐ نے فرمایا ہے۔ جب فتح کا دن آیا تو آپؐ نے فرمایا: اے عثمان کنجی لاؤ۔ میں لے کر حاضر ہوا۔ آپؐ نے اسے میرے ہاتھ سے لے لیا اور پھر واپس کر دی اور فرمایا: ''اسے لے لو، ہمیشہ کے لیے نسلاً بعد نسلاً۔ ظالم کے سوا کوئی اسے تم سے نہ چھینے گا، اے عثمان اللہ نے تمہیں اپنے گھر کا امین بنایا

ہے، اس لیے اس گھر سے جو آئے نیکی کے ساتھ کھاؤ''۔ پھر مجھے مکہ میں ہجرت سے پہلے آپؐ کا قول یاد آ گیا کہ ''شاید تو دیکھے گا یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور جسے میں چاہوں گا دوں گا''۔ میں نے عرض کیا: ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔[۱۶]

قانون کی بالادستی

فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے دوٹوک انداز میں قانون کی بالادستی کا اعلان ہی نہیں کیا، بلکہ قانون کی نظر میں مساوات انسانیت کو بھی قائم فرمایا۔ اس موقع پر قبیلۂ مخزوم کی فاطمہ نامی ایک خاتون نے کسی کا زیور چوری کیا تو سزا سے بچنے اور خاندانی شرافت کی ساکھ قائم رکھنے کی خاطر اس کے قبیلے کے لوگ آپؐ کے محبوب ومقرب ساتھی حضرت اسامہ بن زیدؓ کے پاس سفارش کے لیے پہنچے۔ جب انھوں نے آپؐ سے اس کی سفارش کی تو غصہ سے آپؐ کا چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا اور ان سے مخاطب ہوکر فرمایا: **اتکلمنی فی حد من حدود اللہ ؟** (کیا تم اللہ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سفارش کرتے ہو؟)

اس کے بعد شام کے وقت آپؐ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور حمد وثنا کے بعد فرمایا:

اما بعد فانما اھلک الناس قبلکم انھم کانو اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد والذی نفس محمد بیدہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا" [۱۷]

اما بعد، تم سے پہلے کے لوگ اس وجہ سے تباہ ہوگئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی کم زور آدمی چوری کرتا تو اس کو فوراً سزا دیتے۔ قسم اس ہستی کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالتا۔

اس کے بعد آپؐ نے اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ آپؐ کے اس عمل سے اسلام میں ہمیشہ کے لیے غیر قانونی سفارش ممنوع قرار پائی اور قانون بلاتفریق رنگ و نسل، مذہب وعقائد، اشرف، اطرف، امیر وغریب سب کے لیے مساوی قرار پایا۔

فاتح افواج کے لیے اعلان

مکہ میں فاتحانہ قدم رکھتے ہوئے آپؐ نے اپنے سپہ سالاروں اور افواج کو جو حکم دیا وہ تا قیامت فاتحین کے لیے مشعل راہ ہے۔ آپؐ نے اعلان فرمایا:

من دخل دار ابی سفیان فھو آمن	جو شخص ابوسفیان کے گھر داخل ہو اس کو امن ہے
من دخل دار حکیم فھو آمن	اور جو حکیم کے گھر میں داخل ہو وہ مامون ہے
ومن دخل المسجد فھو آمن	اور جو شخص مسجد میں داخل ہو وہ بھی مامون ہے
ومن اغلق بابہ و کف یدہ فھو آمن [۱۸]	اور جو شخص اپنا دروازہ بند کرلے اور لڑائی سے دست کش ہو جائے وہ بھی مامون ہے۔

فاتح افواج کو ہدایت:

ابن اسحاق اور بلاذری کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوتے ہوئے افواج کو حکم دیا کہ وہ مختلف راستوں سے داخل ہوں اور ان احکام کی پابندی کریں:

۱- جو شخص ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۲- جو شخص خانۂ کعبہ کے اندر پہنچ جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۳- جو شخص اپنے گھر کے اندر بیٹھا رہے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۴- جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۵- جو شخص حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۶- بھاگ جانے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔
۷- زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔
۸- اسیروں کو قتل نہ کیا جائے۔[۱۹]

حواشی ومراجع

۱۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر، ۱۹۳۷، ۳/۳۵۵-۳۵۶

۲۔ ابن ہشام، ۳/۳۶۳-۳۶۴

۳۔ ابن ہشام، ۳/۳۶۶

۴۔ الطبری، ابوجعفر محمد بن جریر، الجزء الثانی، موسسۃ العلمی للمطبوعات، بیروت، ۱۹۷۹ء، الجزء الثانی، ص ۲۸۱-۲۸۲

۵۔ ابن ہشام، ۳/۳۶۹

۶۔ ابن ہشام

۷۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب صلح حدیبیہ

۸۔ ابن ہشام، ایضاً، ص ۳۶۷

۹۔ ایضاً، ص ۳۷۲-۳۷۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۷۲

۱۱۔ ایضاً، ۴/۳-۱۴

۱۲۔ ایضاً، ۳/۴۱

۱۳۔ الطبری، ایضاً، ص ۳۳۷-۳۳۸

۱۴۔ ابن ہشام، ۴/۳۵-۳۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۶۔ ابن قیم لجوزیۃ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، الجزء الثالث، بیروت، دار الفکر، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۹۸ء، ص ۳۵۴-۳۵۶

۱۷۔ بخاری، کتاب المغازی، باب ۵۲۳، حدیث نمبر ۱۴۳۶

۱۸۔ ابن ہشام، ۴/۲۳-۲۴

۱۹۔ البلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر، فتوح البلدان، اردو ترجمہ، سید ابو الخیر مودودی، کراچی، نفیس اکیڈمی طبع سوم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۴۸۱-۴۸۷

کارکنانِ ادارۂ تحقیق کی بعض تصانیف

جو مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوئیں

۱-	مومنانہ زندگی کے اوصاف	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۰/-
۲-	اسلام اور آزادئ فکر و عمل	،،	۳۵/-
۳-	کم سنی کی شادی اور اسلام	،،	۷/-
۴-	بچوں کی مزدوری اور اسلام	،،	۵/-
۵-	بندھوا مزدوری اور اسلام	،،	۳/-
۶-	دعوت دین کے علمی تقاضے (ترجمہ)	،،	۴۰/-
۷-	قرآن اور سائنس (ترجمہ)	،،	۲۰/-
۸-	انسانی معاشرہ اسلام کے سایے میں (ترجمہ)	،،	۲۰/-
۹-	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۴۰/-
۱۰-	حقائق اسلام-بعض اعتراضات کا جائزہ	،،	۵۰/-
۱۱-	کفر اور کافر قرآن کی روشنی میں	،،	۲۰/-
۱۲-	قرآن کریم کا اعجاز بیان (ترجمہ)	،،	۷۵/-
۱۳-	سیرت رسول- دروس اور نصائح (ترجمہ)	،،	۱۶۰/-
۱۴-	عہد نبوی کا مدنی معاشرہ (ترجمہ)	،،	۱۶۰/-
۱۵-	اسلام اور مغرب کی کش مکش (ترجمہ)	،،	۷۵/-
۱۶-	علم تفسیر- چند بنیادی مسائل (ترجمہ)	،،	۴/-
۱۷-	جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	۸۵/-
۱۸-	مسلمان کی حقیقی تصویر	،،	۳۵/-

≐ ملنے کے پتے ≐

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

سیر وسوانح

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری
حیات اور خدمات کا ایک جائزہ

مولانا محمد شمیم اختر قاسمی

ہندوستان کا قدیم اور مردم خیز صوبہ 'بہار' اپنے ابتدائی مسلم دور سے ہی علما، صوفیا اور مشائخ کا مرکز رہا ہے۔ یہیں کے ایک مشہور صوفی خضر پارہ کی شہرت ہندوستان کے مغربی علاقہ تک پہونچی ہوئی تھی، جن سے بعض روایات کے مطابق حضرت نظام الدین اولیا (م ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) نے بھی استفادہ کیا۔ سلطان ناصر الدین محمود (۶۳۹ھ/ ۱۲۴۶-۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء) کے دور میں بہار پورے برصغیر کے علما وصوفیا کا عقیدت گاہ بن گیا۔ یہیں مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کی ولادت ہوئی، جن کی مساعی اور مجتہدانہ بصیرت سے اس خطے میں تصوف کے فردوسی سلسلہ کی خوب اشاعت ہوئی اور بہار کے کونے کونے میں آپ کا فیض پہونچا۔

مختصر حالاتِ زندگی

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار کی ریاست پٹنہ کے ایک گاؤں 'منیر' میں جمعہ کے دن ۲۹/شعبان ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔[۱] آپ کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہ اپنے زمانہ کے بڑے عالم اور مشائخ کبار میں سے تھے۔ وہ شام (بیت المقدس) سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آئے اور بہار کے ایک گاؤں 'منیر' میں قیام پذیر ہوئے۔[۲] آپ کے نانا شیخ شہاب الدین جگت جوت سہروردی سلسلہ کے مشائخ میں شمار کیے جاتے تھے۔ کاشغر سے چل کر ہندوستان آئے اور موضع 'جٹھلی' میں قیام فرمایا جو پٹنہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ ان کی ایک بیٹی سے شیخ شرف الدین اور دوسری سے شیخ احمد چرم پوش جیسے نامور مشائخ پیدا ہوئے۔[۳] آپ کی والدہ نے آپ کو کبھی بغیر وضو کے دودھ نہیں پلایا۔[۴] شیخ

شرف الدین کے والد یحییٰ منیری بھی ایک صاحب علم اور صاحب ذوق بزرگ تھے۔ان کو عقیدت وارادت مولانا تقی الدین عربی سے حاصل تھی جو شیخ احمد دمشقی کے خلفا میں سے تھے۔

شیخ کی ابتدائی تعلیم وتربیت گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔عربی کی مبتدی کتابیں پڑھنے کے بعد شیخ شرف الدین شیخ ابوتوامہ (م۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء) کے ہمراہ سنار گاؤں چلے گئے۔ وہیں آپ نے درسیات کی اعلیٰ کتابیں، کلام پاک تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام کے علاوہ علوم عقلی مثلاً منطق وفلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی اور تصوف کی کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔۵ بعد فراغتِ تعلیم طویل عرصہ تک شیخ ابوتوامہ کی خدمت میں رہے۔ انہیں کی لڑکی سے آپ کا نکاح ہوا۔۶ جن سے کئی اولادیں ہوئیں مگر سوائے ایک کے سب بچے ایام طفولیت میں ہی فوت ہو گیے۔تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے استاذ اور مربی سے وطن جانے کی اجازت چاہی اور اپنے بیٹے ذکی، جو عمر میں بہت چھوٹے تھے، کو ساتھ لیا اور وطن پہنچے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی والد ماجد کا انتقال ہو گیا تھا۔اس لیے پہلے والد کی قبر کی زیارت کی، پھر والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔۷

چند مہینے ہی والدہ کی خدمت میں گزارے تھے کہ مرشد کی تلاش میں ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۱ء کے اواخر میں اپنے بیٹے ذکی الدین کو والدہ کے حوالے یہ کہہ کر کہ ''ذکی کو شرف الدین کی جگہ سمجھیے'' دہلی کے سفر پر نکل گیے۔اس سفر میں آپ نے اپنے بھائی شیخ جلیل کو ساتھ کر لیا۔دہلی پہنچ کر متعدد مشائخ کرام کے آستانوں پر حاضر ہوئے۔حضرت نظام الدین اولیا سے بھی ملاقات کی اور ان کی صحبت اختیار کرنا چاہی، مگر انہوں نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ''ایک شاہین بلند پرواز ہے، لیکن ہمارے جال کی قسمت میں نہیں ہے۔''۸ پھر آپ پانی پت شیخ بوعلی قلندر کی خدمت میں پہونچے، انہوں نے بھی اس جملے کے ساتھ کہ ''شیخ است اما مغلوب حال است بہ تربیت دیگرے نمی پرداز''۹ (شیخ ہیں لیکن مغلوب الحال، دوسروں کی تربیت نہیں کر سکتے۔) واپس کر دیا۔ چار و ناچار دوبارہ دہلی لوٹ آئے۔اپنے بھائی شیخ جلیل کے اصرار پر شیخ نجیب الدین فردوسی کے آستانہ پر حاضر ہوئے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان سے بے حد متاثر ہوئے۔کچھ وقت ان کی صحبت میں

گزارا ، پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور شیخ نے یہ کہتے ہوئے کہ ’’برسوں سے تمہارے انتظار میں ایک امانت لیے بیٹھا ہوں جو تمہارے سپرد کرنی ہے‘‘ ۱۰؎ آخر قہ خلافت، شجرہ اور کچھ نصائح لکھ کر عنایت کیے اور اپنے وطن لوٹ جانے کو کہا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ ’’ راستہ میں کوئی ناگہانی خبر ملے تو لوٹ کر دہلی نہ آنا‘‘ راستہ ہی میں مرشد کے انتقال کی خبر ملی ،مگر حسبِ ہدایت انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے اپنے وطن سے تیس کیلو میٹر ’بہیا‘ کے مقام پر پہونچے جو جنگلی علاقہ ہے۔ وہیں آپ کو مور کی آواز سنائی دی تو دل میں ایک ہوک اٹھی اور صبر وضبط کا یارا نہ رہا۔ جنگل میں داخل ہوئے اور غائب ہوگئے ۔شیخ جلیل اور قافلہ کے لوگوں نے آپ کو بہت تلاش کیا ،کہیں پتہ نہ چلا۔ بالآخر وہ لوگ لوٹ کر اپنے وطن چلے آئے اور شیخ کا عنایت کیا ہوا خلافت نامہ ،نصیحت نامہ اور شجرہ ان کی والدہ کے حوالے کر دیا۔ ۱۱؎

اسی جنگل میں جہاں آدم زاد کا نام ونشان نہ تھا، انہوں نے ۱۲؍سال زندگی گزاری اور یادِ الٰہی وذکر وفکر کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا ۔سخت مجاہدے کیے اور بڑی ریاضتیں کیں۔ وہاں سے راج گیر کے جنگل میں پہونچے جہاں لوگوں کی نظر آپ پر پڑی۔

نالندہ اور گیا کے جنگلات وکھنڈرات بدھ مذہب کے معتقدین کے لیے بڑی معنویت رکھتے ہیں ۔اغلب ہے کہ وہاں ان کے اور شیخ کے درمیان مناظرے اور مکالمے بھی ہوئے ہوں گے۔ ان معرکوں کے نتیجے میں اشاعتِ اسلام اور قبولِ اسلام کے واقعات کا رونما ہونا بعید نہیں ۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

’’اسی صحرا نوردی کے زمانہ میں بعض ہندو جوگیوں سے روحانی معرکے ہوئے جنہوں نے حضرت مخدوم الملک کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔‘‘ ۱۲؎

دھیرے دھیرے لوگوں کو معلوم ہونے لگا کہ شیخ شرف الدین خواجہ نجیب الدین فردوسی کے خلیفۂ خاص میں سے ہیں ،تو آپ سے علمی وروحانی استفادہ کے لیے ان کی بھیڑ جمع ہونے لگی ۔وہ آپ سے تعلق قائم کرتے ،دن بھر صحبت میں رہتے اور شام کو گھر لوٹ آتے۔ اس سلسلے میں مکتوباتِ صدی میں یہ صراحت ملتی ہے:

''راج گیر کو بہیا شریف سے قربت حاصل ہے۔اس لیے رفتہ رفتہ مخدوم جہاں کے راج گیر کے قیام کی خبر پھیل گئی اور لوگوں کا ہجوم بڑھنے لگا،تو آپ نے بدرجۂ مجبوری بہار شریف میں اقامت اختیار کر لی۔اس طرح درس وتدریس اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری ہوا۔''[۱۳]

راج گیر کے جنگل میں لوگوں کے پہونچنے کی خبر مولانا نظام الدین کو ہوئی جو خواجہ نظام الدین اولیا کے خلفا میں سے تھے،تو ان کے اندر بھی شیخ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ شیخ سے ملے اور ان سے قلبی وروحانی سلسلہ قائم کیا۔ انہی حضرات کے اصرار پر شیخ شرف الدین ہر ہفتہ جمعہ کے دن شہر میں آنے لگے۔شہر کی جامع مسجد میں نماز پڑھتے ،اس کے بعد کچھ دیر مولانا نظام الدین اور معتقدین کے ساتھ وقت گزارتے ،پھر جنگل میں چلے جاتے ۔بعد میں مریدین ومتوسلین نے آپ سے زیادہ صحبت اور فیض حاصل کرنے کے لیے باہم مشورہ سے شہر سے باہر دو چھپر ڈال دیے، جہاں کچھ دیر ٹھہرتے ،پھر جنگل کی طرف نکل جاتے ۔اس طرح یہاں آپ کے ٹھہرنے کی مدت دن بہ دن بڑھتی گئی ،کبھی ایک روز تو کبھی اس سے زیادہ یہاں ٹھہرنے لگے۔پھر مولانا نظام الدین نے صوبۂ بہار کے گورنر مجدالملک کی اجازت سے یہاں پر ایک پختہ عمارت بنوادی۔اب تو یہ جگہ ہمیشہ کے لیے مرجعِ خلائق بن گئی۔ان کے انتقال کے بعد یہیں مزار بنایا گیا،جواب بھی موجود ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو بڑی لمبی عمر سے نوازا اور ازداجی زندگی سے بھی بہت جلد آزاد کر دیا۔وطن لوٹنے سے پہلے ہی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا۔اس لیے آپ نے عمر عزیز کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ تربیتِ خلق اور رشد وہدایت میں بسر کیا۔وفات تک یہی شغل رہا۔آپ کے تین اولادیں ہوئیں ۔دولڑکے تو ایام طفولیت ہی میں انتقال کر گیے۔ایک شاہ ذکی الدین بڑے ہوئے اور ان کی تربیت وپرداخت شیخ کی والدہ کے ہاتھوں ہوئی۔لیکن وہ بھی شیخ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے۔جب ان کی شادی ہو چکی تھی جس سے ایک لڑکی بھی تھی۔اس کا نکاح سید وحید الدین خواہر زادہ شیخ نجیب الدین

فردوسی سے ہوا تھا۔[۱۴]

شیخ شرف الدین کے مریدین ومتوسلین کی تعداد بے شمار ہے۔ان کے انتقال کے بعد انہی خلفا ومریدین نے ان کی تعلیمات وارشادات کو دوسروں تک پہنچایا اور سلسلۂ فردوسیہ کو پورے خطۂ بہار میں پھیلا کر اس سلسلہ کو ہندوستان میں زندہ وقائم رکھا، ورنہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے بعد یہ ہندوستان میں بہت جلد دم توڑ دیتا اور کوئی اس کا نام لینے والا نہ ہوتا۔

۷۸۲ھ/۱۳۷۰ء بروز جمعرات بوقت عشا علم وعرفان کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔اس وقت آپ کی عمر ۱۲۱/سال کی تھی۔آپ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازہ کی نماز وہی شخص پڑھائے جو صحیح النسب، تارک المکلت اور حافظ قراءات سبعہ ہو۔ چنانچہ یہ سعادت مخدوم اشرف جہانگیر رحمہ اللہ کو حاصل ہوء، جو مخدوم سے حصول بیعت کی نیت سے یہاں آئے تھے،مگر وہ اس وقت پہونچے جب مخدوم عالم جاودانی کو رحلت فرما چکے تھے۔[۱۵]

علوم میں کامل دستگاہ

شیخ شرف الدین نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اپنے استاذ ومربی شیخ ابوتوامہ کی خدمت میں گزارا۔اس عرصہ میں آپ نے ان سے متعدد علوم وفنون سیکھے اور پڑھے۔خود بھی فضول چیزوں میں وقت صرف کرنے کے بجائے کتابوں کے مطالعہ میں لگے رہے۔ علوم ظاہری کی شاید ہی کوئی شاخ ایسی ہو جس سے آپ کا تعلق نہ ہو۔چنانچہ انہوں نے نہ صرف علوم باطنی میں لوگوں کو فیض پہنچایا، بلکہ علوم ظاہری کی بھی بڑے پیمانے پر تفہیم و اشاعت کی اور بالخصوص قرآن وحدیث،فقہ اور فلسفہ تو ان کی گفتگو میں رچے بسے رہتے تھے۔جیسا کہ سید ضمیر الدین لکھتے ہیں:

''اگر تصوف کے ساتھ آپ کو انتساب نہ ہوتا تو نہایت سنہرے حروف میں آپ کا نام علمائے ظواہر کی فہرست میں درخشاں نظر آتا۔حدیث، فقہ،اصول تفسیر،کلام، ادب،منطق،فلسفہ،ریاضی، ہیئت، ہندسہ کوئی فن لو، سب پر حاوی تھے، بلکہ اکثر میں پوری دستگاہ اور کامل تبحر تھا''۔[۱۶]

تصنیفی خدمات

صوفیا کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم صوفیا ہیں جنہوں نے تصنیفی میدان میں کوئی اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے مریدین اور عقیدت مندوں نے ان کے ملفوظات وارشادات کو قلم بند کر دیا ہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ایسے صاحبِ علم صوفی ہیں جو زبان کے دھنی تو تھے ہی، ساتھ ہی قلم کے بھی دھنی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا شمار کثیر التصانیف صوفیا میں ہوتا ہے۔ سیرۃ الشرف میں آپ کی ۱۶ رکتابوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں مکتوبات وملفوظات بھی شامل ہیں۔ جن کے نام حسب ذیل ہیں:

''مکتوبات صدی، مکتوبات دو صدی، مکتوبات بست وہشت، اجوبہ، فوائد رکنی، ارشادالطالبین، ارشادات السالکین، رسالۂ مکیہ، معدن المعانی، لطائف المعانی، مخ المعانی، خوان پر نعمت، تحفۂ غیبی، ملفوظات زادسفر، عقائد شرفی، شرح آداب المریدین''۔ ۱۷

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے رسالہ در طلب طالبان، فوائد مریدین، بحر المعانی، صفر المظفر، گنج لایفنیٰ اور مونس المریدین کا اضافہ کیا ہے۔ ۱۸ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی انہی کتابوں کے نام درج کیے ہیں۔ ۱۹

مکتوبات کی علمی وادبی حیثیت

ان تمام تصنیفات اور مکتوبات وملفوظات میں جو شہرت وقبولیت اور اہمیت شیخ کے مکتوبات کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب کے حصے میں نہ آسکی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مکتوباتِ صدی کی اہمیت اہل حال وقال کے نزدیک مسلّم ہے۔ یہ مکتوبات ۷۴۷ھ/ ۱۳۴۶ء میں قاضی شمس الدین کے نام لکھے گیے ہیں۔ اس کتاب کی علمی وادبی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''حضرت مخدوم کی زندہ یادگار اور ان کے علوم وکمالات کا آئینہ ان کے مکتوب کا وہ نادر مجموعہ ہے جو نہ صرف اس عصر کی تصنیفات میں، بلکہ معارف وحقائق کے پورے

اسلامی ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔علم کی گہرائی ،تحقیقات کی ندرت ، مشکلات کی عقدہ کشائی،ذاتی تجربات ،اذواق صحیحہ ،مجتہدانہ علم ونظر،کتاب وسنت کے صحیح وعمیق فہم، مقام نبوت کی حرمت وعظمت کے بیان،شریعت کی حمایت اور وجد انگیز نکات اور شرعی لطائف کے اعتبار سے (ہمارے محدود علم میں) پورے اسلامی کتب خانہ میں حضرت مخدوم کے مکاتیب اور مکتوبات امام ربانی کی نظیر نہیں آتی۔ان مکاتیب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امت محمدیہ کے محققین وعارفین کے علم وفکر کی رسائی کن بلندیوں تک ہے اور انہوں نے معرفتِ الٰہی ،ایمان ویقین،مشاہدہ وادراک ،تصفیۂ قلب وتزکیۂ نفس، روح کی لطافت وذکاوت ،اخلاق کی باریکیوں اور نفس انسانی کی کمزوریوں اور غلطیوں کی دریافت میں کہاں تک ترقیات وفتوحات حاصل کیں اور ان کی ذکاوت اور قوتِ فکریہ کے طائرِ بلند پرواز نے کن کن بلند شاخوں پر اپنا نشیمن بنایا اور کن کن فضاؤں میں پرواز کی''۔[۲۰]

اس کے بعد اس کی ادبی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''علوم ومعارف کے علاوہ یہ مکاتیب زورِ قلم ،قوتِ بیانی اور حسنِ انشا کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان کے بہت سے ٹکڑے اس قابل ہیں کہ دنیا کے بہترین ادبی نمونوں میں شامل اور''ادبِ عالی'' میں شمار کیے جائیں۔غرض اسی باطنی کیفیت ،یقین و مشاہدہ،دعوت کے غلبہ، اہلِ عصر واہلِ تعلق کو حقائق سے آگاہ کرنے اور منزلِ مقصود پر پہنچانے کے جذبہ،اخلاص ودردمندی،روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور سب کے ساتھ ذوقِ سلیم اور زبان پر قدرت نے حضرت شیخ شرف الدین کو ایک بلند ادبی مقام عطا کیا ہے اور انہوں نے اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کے لیے ایک مستقل اسلوب پیدا کرلیا ہے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ان کے مکتوبات نہ صرف فارسی ادبیات بلکہ اسلامی ادبیات میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور معارف وحقائق ،دعوت واصلاح کے وسیع ذخیرے میں کم چیزیں ایسی ہوں گی جو اپنی ادبیت اور قوتِ تاثیر میں ان کی نظیر ہوں''۔[۲۱]

مکتوبات صدی کے علاوہ ایک دوسرے مجموعۂ مکاتیب' مکتوبات سہ صدی' (جو شیخ مظفر کے سوال کے جواب میں تحریر کیے گیے تھے) کو بھی بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

مکتوبات کا ایک تیسرا مجموعہ بھی ہے جو ۷۶۹ھ/ ۱۳۶۷ء کے درمیان قلمبند کیے گیے تھے اوران کے مکتوب الیہ شیخ کے خلفا و مریدین اور طالبانِ حق وعلم ہیں۔

ان مکتوبات کی اہمیت کو نہ صرف بعد کی صدیوں میں تسلیم کیا گیا، بلکہ ان کے معاصر علما و صوفیا نے بھی ان کے مطالعہ اور تفہیم میں اپنا وقت صرف کیا ہے۔ خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی کو یہ کہنا پڑا کہ شرف الدین یحییٰ منیری نے ہم لوگوں کے لیے صدسالہ کفر کو ہتھیلی پر رکھ دیا ہے۔ حضرت سید جلال الدین جہاں گشت سے ان کے آخر عمر میں کسی نے پوچھا کہ آپ کا کیا شغل رہتا ہے تو انہوں نے فرمایا: ''شیخ شرف الدین کے مکتوبات کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔'' یہ سن کر ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے ان مکتوبات کو کیسا پایا؟ تو فرمایا: ''ان مکتوبات کے بعض مقامات کو اب میں سمجھا ہوں۔'' ۲۲

اصلاحی وتجدیدی خدمات

شیخ شرف الدین کو دنیا سے رحلت کیے ہوئے کئی صدیاں گذر گئی ہیں، مگر آپ کی یاد سے آج بھی خطۂ بہار کا کوئی حصہ غافل نہیں۔ آپ کے وجودِ مسعود سے یہ خطہ اسلام کی روشنی سے معمور ہوا۔ بہت سے بھٹکے ہوئے انسان راہ راست پر آئے۔ آپ کے مکتوبات وملفوظات اور تصانیف سے مشتاقانِ علم کو نئی روشنی ملی۔ اسی کے ساتھ آپ نے مسلمانوں کو شرک وبدعات سے نکالنے کی بھی بڑی جدو جہد کی۔ دور دراز مقامات پر اپنے خلفا و مریدین کو مامور فرمایا کہ وہ وہاں اسلام کی اچھی نمائندگی اور صحیح ترجمانی کریں۔ گویا کہ آپ نے اپنے عہد میں اصلاح وتجدید کا جو فریضہ انجام دیا ہے اسے کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کی خدمات پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا تمام تر کارنامہ یہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے باشندوں کو خدا کا راستہ دکھایا۔ معرفتِ الٰہی اور تعلق مع اللہ کی ضرورت و اہمیت دل نشیں کی، ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں عشقِ الٰہی اور خدا طلبی کی حرارت پیدا کردی اور سکون ومعرفت کے اسرار ونکات اور لطیف وبلند علوم کا اظہار

فرمایا، بلکہ بعض دوسرے مصلحین امت اور محققین کی طرح ان کا یہ بھی عظیم و روشن کارنامہ ہے کہ انہوں نے بروقت دین کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ مسلمانوں کے دین وایمان کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالیوں، ملحدین کی تحریفات اور باطنیت و زندقہ کے اثرات سے محفوظ رکھا اور ان مغالطوں کا پردہ چاک کیا جو بداعتقاد صوفیوں، جاہل مشائخ اور فلسفہ و باطنیت سے متاثر اشراقیین کی دعوت وتبلیغ سے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں (جہاں اسلام بہت چکر کاٹ کر پہنچا تھا اور جہاں کتاب وسنت سے براہ راست واقفیت پیدا کرنے کے وسائل شروع سے کمزور اور محدود رہے) سحر کا اثر رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں ان سب عقائد و خیالات پر کاری ضرب لگائی، جس کے پردہ میں پنہاں الحاد وزندقہ پھیل رہا تھا اور اسلامی عقائد متزلزل ہو رہے تھے اور اسلام کے عقائد صحیحہ اور اہلِ سنت کے مسلک کی نہایت موثر وطاقت ور وکالت اور تبلیغ کی۔ وہ چونکہ حقائق و معارف میں بلند ترین پایہ رکھتے تھے، اشراق اور کشف وشہود کے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے تھے، ریاضات ومجاہدات کی طویل ترین ودشوار ترین کھائیاں طے کر چکے تھے اور اس میدان میں ان کا مرتبہ 'امامت واجتہاد' تک پہنچنا سب کو تسلیم تھا، اس لیے اس بارے میں ان کی تصریحات وتحقیقات خاص وزن اور قیمت رکھتی ہیں اور ان کی تردید بلکہ تحقیر کسی بڑے سے بڑے صاحب 'اشراق وکشف' کے لیے آسان نہیں''۔[۲۳]

فردوسی سلسلہ کی نشر واشاعت

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے سلسلۂ فردوسیہ کی نشر واشاعت اس انداز سے کی کہ ہندوستان کے کونے کونے میں اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے اور دور دراز سے چل کر لوگ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور سلسلۂ فردوسیہ سے جڑ جاتے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ شیخ یحییٰ منیری کی وجہ سے ہی اس سلسلے کو ہندوستان میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا، ورنہ شیخ نجیب الدین کے انتقال (۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء) کے بعد یہ سلسلہ یہیں دم توڑ چکا تھا۔ غالباً شیخ نجیب الدین فردوسی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شیخ منیری کے ذریعہ اس

سلسلہ کوتقویت ملے گی اورانہی کی مساعی سے یہ سلسلہ ہندوستان کے اہم سلسلوں میں اپنی جگہ بنائے گا۔اس لیے انہیں خلافت سے نوازنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی ، بلکہ ایک طرح سے ان کی آمد کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

یہ سلسلہ ہندوستان میں کب اور کیسے پہنچا؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی اور خواجہ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی (م ۵۶۳ھ/ ۱۱۶۸ء) کے خلفائے کبار میں ایک بزرگ ابوالحیات احمد بن عمر مشہور بہ خواجہ نجم الدین کبری تھے،جن کا وطن خوازم تھا۔ان کے خلفا میں ایک جلیل القدر خلیفہ خواجہ سیف الدین باخرزی تھے۔ ان کے خلیفہ خواجہ بدر الدین سمرقندی مشائخ فردوسیہ میں سب سے پہلے ہندوستان آئے اور یہاں سکونت اختیار کی۔اس طرح ان کے ذریعہ طریقۂ فردوسیہ کی بنیاد پڑی۔ خواجہ بدرالدین سمرقندی کے خلیفۂ خاص خواجہ رکن الدین فردوسی تھے،ان کے برادر زادہ اور خلیفہ خواجہ نجیب الدین فردوسی تھے ، جن کے ہاتھ پر شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی۔ پھرانہوں نے اس کی اشاعت وتوسیع کی۔

شاہانِ دہلی کی عقیدت

جب شیخ منیری کی مقبولیت اوران کے ہاتھوں سلسلۂ فردوسیہ کی نشرواشاعت کی شہرت دہلی اور اس کے اطراف میں پھیلی تو سلطانِ وقت محمد شاہ تغلق (۷۲۵ھ-۱۳۲۵ء/۷۵۲ھ-۱۳۵۱ء) کے کانوں میں بھی یہ خبر پہنچی ۔وہ آپ سے غائبانہ بہت متاثر ہوا اور اپنی عقیدت کا رشتہ قائم کرتے ہوئے اس نے شیخ کی خدمت میں مجد الملک گورنر صوبۂ بہار کی معرفت گراں قدر تحفے تحائف اور خانقاہی نظام کو چلانے کے لیے راجگیر کے قطعات آپ کے حوالے کردیے ۔ساتھ ہی ایک مصلائے بلغاری بھی آپ کی خدمت میں بھیجا۔بہ تقاضائے مصلحت شیخ نے سلطان کے تحفے کو قبول کرلیا،مگر وہ اس سے خوش نہ تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسا موقع آئے کہ اس کے بھیجے ہوئے سامان کو واپس کردیا جائے۔جب محمد شاہ تغلق کا انتقال ہوگیا اور فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ- ۱۳۵۱ء/

۷۹۰-۱۳۸۸ء) تختِ سلطانی پر رونق ہوا تو انہوں نے محمد شاہ تغلق کا عنایت کیا ہوا جاگیر نامہ لوٹا دیا۔ فیروز شاہ نے بھی حصول برکت کے لیے آپ کی خدمت کرنی چاہی اور ایک بڑی رقم عنایت کی جس کو آپ نے قبول فرمالیا۔لیکن اسے بھی غربا ومساکین میں تقسیم کردیا۔۲۴ معاصر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ محمد شاہ تغلق نے ہی آپ کی خانقاہ منظّم طریقے سے تعمیر کروائی تھی۔۲۵

حکم رانوں کو نصیحت

جیسا کہ عرض کیا گیا، شرف الدین یحییٰ منیری کے تعلقات فیروز شاہ تغلق سے اچھے تھے۔ وہ آپ کی بڑی عزت کرتا تھا، جب کہ اس سے قبل جو حکومت گزری وہ کسی قدر جابرانہ وظالمانہ تھی اور بالخصوص علما وصوفیا کے حق میں تلخ ثابت ہوئی۔اس کے پیش نظر شیخ نے سلطان کو حدیثِ رسول کی روشنی میں اپنے مکتوب کے ذریعہ ہدایت کی کہ وہ سلطنت میں عدل وانصاف کو فروغ دے، اسلام کی حفاظت اور اس کے فروغ اشاعت پر اپنی توجہ مبذول کرے اور منکرات ومنہیات سے اجتناب کرے۔ چنانچہ وہ اپنے مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے، خدا تعالیٰ قیامت کے دن پل صراط کو عبور کرنے میں اس کی مدد کرے گا اور بہشت میں جگہ دے گا اور جو کوئی مظلوم کو دیکھتا ہے اور وہ مظلوم اس سے فریاد کرتا ہے، لیکن وہ فریاد نہیں سنتا تو قبر کے اندر اس کو آگ کے سو کوڑے مارے جائیں گے۔ جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے اس کے لیے تہتر مغفرت لکھی جاتی ہے، ان میں سے ایک تو اس کو دنیا میں مل جاتی ہے، اس سے اس کا کام سدھرتا ہے اور بقیہ بہتّر عقبیٰ میں ملتی ہے..... پیغمبرؐ نے فرمایا: ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے''۔۲۶

اسی طرح امرا، اصحابِ منصب اور اربابِ قدر ومنزلت کو مخاطب کرتے ہوے لکھتے ہیں:

''امرا، اصحابِ منصب اور اربابِ قدر ومنزلت کے لیے اللہ کے پاس پہنچنے کا

سب سے نزدیک راستہ یہ ہے کہ وہ عاجزوں کی دست گیری اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کریں۔ چنانچہ ایک بزرگ نے فرمایا کہ اللہ کے یہاں پہنچنے کی راہیں تو بہت ہیں، لیکن سب سے نزدیک راہ دلوں کو راحت پہنچانا ہے۔ان بزرگ سے یہ کہا گیا کہ جس شہر کے وہ رہنے والے ہیں اس کا بادشاہ شب بیدار ہے ،نفل نمازیں بہت پڑھتا ہے،نفل روزے بھی رکھتا ہے ،فرمایا: بے چارے نے اپنے کام کو تو کھو دیا،لیکن دوسروں کے کام میں لگا ہوا ہے۔لوگوں نے ان بزرگ سے پوچھا کہ آخر اس بادشاہ کا اپنا کام کیا ہے تو پھر فرمایا کہ اس کا کام تو یہ ہے کہ طرح طرح کے کھانے پکوائے اور بھوکوں کو پیٹ بھر کھلوائے ،طرح طرح کے کپڑے سلوائے اور ننگوں کو پہنوائے ،اجڑے ہوئے دلوں کو آباد کرے ،حاجت مندوں کی دست گیری کرے ،نفل نمازیں پڑھنا اور نفل روزے رکھنا تو درویشوں کا کام ہے''۔[۲۷]

شرک وبدعات سے اجتناب

شیخ شرف الدین منیری کی زندگی کا یہ پہلو بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اپنے معاصر صوفیا ومشائخ سے الگ تھلگ زندگی گزاری۔ جو بھی ان کی مجلس میں پہنچا اور جس نے بھی آپ سے تعلق قائم کیا سب کو یکساں حقوق دیے اور اپنی مجلس کے دروازے کسی کے لیے بند نہ کیے۔ یہاں تک کہ کسی کو آدابِ مرشد ومجلس بجالانے کا بھی پابند نہ بنایا اور نہ کسی کو اس کی اجازت دی کہ نہ زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد انہیں قبلہ وکعبہ جانیں اور نہ کسی ولی اور صوفی سے ایسی عقیدت کا اظہار کرے جس سے شرک وکفر کی بو آتی ہو۔چشتی وسہروردی سلسلے کے بعض صوفیا اپنے مریدوں کو ایسی تعلیم دیتے تھے جو شرک سے کسی درجہ کم نہیں ،مثلاً قبروں پر سجدہ کرنا ،ان کی قبروں پر پھول نچھاور کرنا اور اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے صوفیائے کرام سے استعانت طلب کرنا وغیرہ۔

احکامِ شریعت سے آزادی کا رد

اسی طرح آپ نے اس نزاع اور انحرافِ شریعت کے مسئلہ کو بھی بڑے عمدہ

طریقے سے حل کیا جو عام طور سے صوفیا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض صوفیا خود کو احکامِ شریعت پر عمل کرنے کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کی پابندی کی حد ایک خاص وقت تک رہتی ہے۔ جب وہ اس منزل سے گزر جاتے ہیں تو اس کے لیے شریعت پر عمل کرنا کوئی ضروری امر نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ یہ عقیدہ دن بدن مقبول ہوتا جارہا تھا جس سے گمراہی پھیل رہی تھی۔ چنانچہ شیخ نے اس مسئلہ کا مکمل اور مدلل تصفیہ کیا اور بڑے بلیغ انداز میں لکھا:

''مقصود ریاضت سے یہ ہے کہ ذکرِ حق دل پر غالب ہوجائے اور ذکرِ خداوندی سے دل میں ایسی جلا پیدا ہو کہ ساری ظلماتِ بشریت دور ہوجائیں، تاکہ حقیقت معرفت سالک کو حاصل ہو اور غرض شریعت ورزی سے یہی ہے کہ کعبۂ وصال تک پہنچیں۔ جب وہاں تک رسائی ہوگئی تو زاد وراحلہ کی کیا حاجت باقی رہی۔ ان توہمات کے بعد اس قوم کو یہ خلل دماغ میں پیدا ہوجاتا ہے کہ نماز ادا کرنے کو حجاب سمجھنے لگتی ہے۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ ہم تو خود ہر وقت مشاہدے میں ہیں۔ مقصود نماز، رکوع وسجود سے تو دل کی غفلت دور ہونا ہے، حضورِ دل پیدا ہونا ہے۔ جب ایک ساعت بھی غفلت نہیں ہوتی اور علمِ ملکوت پیش نظر ہے۔ معاذ اللہ، معاذ اللہ، یہی بعینہٖ ابلیس کا واقعہ ہے۔ کمالِ قرب میں وہ ایسا بھولا کہ سجدۂ آدم کی اس نے پروانہ کی اور آدم علیہ السلام کو اپنے سے حقیر سمجھا۔ اس سجدے کو بے سود سمجھ کر باز رہا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ قرآن شریف میں قصۂ ابلیس محض افسانہ کے طور پر بیان ہوا ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ ایسی ہی قوم کی تنبیہ کے لیے ذکر کیا گیا ہے، تاکہ یہ لوگ جان لیں کہ مقرب سے مقرب بھی ہو تو وہ فرماں برداری میں تقصیر نہ کرے اور بزرگوں کا جو یہ خیال ہے کہ شریعت کی راہ میں جینا بھی عین حق طلبی ہے، بالکل بجا و درست ہے۔ اب سنو! اصلی راز جو ابلیس نے اس قوم پر ظاہر نہ کیا اور خود بھی غافل رہا وہ کیا ہے؟ یہ ہے کہ نماز وغیرہ سے غرض صفاتِ بشریت کا دور ہونا اور تقرب خدا حاصل ہونا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرا مقصود یہی ہے کہ پانچ وقت کی نماز گویا دریچۂ کمال کے لیے پانچ مسمار ہیں، اگر اس مسمار کا سہارا نہ ہوگا تو سالک اس مقام سے گر جائے گا۔ ممکن ہے کہ یہاں پر یہ شبہ واقع ہو کہ آخر

نماز کے مسمار ہونے کا سبب کیا ہے اور کس مناسبت سے نماز کو مسمار کہا گیا ہے۔ جواب اس کا بزرگوں نے یہ دیا ہے کہ اس کی وجہ انکشاف قوت بشری سے باہر ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ از قسم خاصیت ہے، عقل اس کی دریافت سے عاجز و قاصر ہے۔ مثلاً مقناطیس کو دیکھو کہ لوہے کو کس طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، کسی کو اس کی خبر نہیں کہ ایسا کیوں ہے"۔ ۲۸

آگے مزید فرماتے ہیں:

"یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ جو بات انسان کے دائرۂ عقل میں نہ آئے وہ یہ سمجھے کہ قدرت بھی اس سے عاری ہے۔ کیا اس آیتِ شریفہ کی خبر نہیں ہے کہ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا. (ہم نے تم کو بہت تھوڑا علم دیا ہے۔) وہ صاحبانِ کشف و کرامت اسی غلطی میں مبتلا ہوئے۔ ایک بھید اسرار شریعت سے، جو ان پر ظاہر ہوا، وہ سمجھے کہ اس کے سوا دوسرا راز نہیں، جیسا کہ ابلیس نے سمجھا تھا۔ یہ بہت ہی بڑا دھوکا ہے جس میں سالکان اور روندگانِ طریقت پر جاتے ہیں اور ایک سخت گھاٹی ہے جس میں اکثر لوگ ہلاک ہو کر رہ گئے ہیں ..... دیکھو بہت ہوشیار رہنے کا مقام ہے۔ جس سالک کا قافلہ لوٹا گیا وہ اسی بادیہ خون خوار میں لٹا ہے۔ اس ہلاکت شدہ قوم نے شریعت ورزی سے صرف ایک ہی مقصود جانا۔ حالانکہ اس میں دوسرے اسرار بھی پوشیدہ ہیں۔ کیسا عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے کہ انہیں کھلی کھلی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر شریعت ورزی میں دوسرے اسرار نہ ہوتے تو خود حضرت پیغمبر ﷺ کو اتنی نماز کی کیا حاجت تھی کہ پائے مبارک ورم کر جاتے۔ کیا آپ یہ نہیں فرما سکتے تھے کہ نماز امت پر واجب ہے، پیغمبر پر واجب نہیں ..... بہر کیف علما ہوں، مشائخ ہوں، صوفی ہوں، کوئی صاحب ہوں، جن کو واقعی کمال حاصل ہوا وہ جانتے ہیں کہ شریعت کا کوئی رکن بھید سے خالی نہیں اور ہر رکن سے سعادتِ آخرت وابستہ ہے"۔ ۲۹

شریعت پر عمل کرنا ہی انسانیت کی معراج ہے اور اس سے کوئی بری نہیں ہو سکتا۔ شریعت کے جو احکام قرآن و سنت سے ثابت ہیں، بالخصوص نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ وہ کسی مجبوری کے تحت ہلکی تو ہو جاتی ہے، مگر اس کی ادائیگی بعد میں لازم و ضروری ہے۔ ایسا نہیں کہ بغیر کسی مجبوری کے نماز معاف ہو گئی یا روزہ کے احکام ساقط ہو گیے۔ چنانچہ

احکامِ شریعت کی ادائیگی کو لازم قرار دیتے ہوئے شیخ لکھتے ہیں:

''اگر بزرگوں کے معاملات پر غور کرو تو سمجھو کہ شریعت کے ساتھ ان کے کیا کیا آداب رہے ہیں ۔مرتے دم بھی آدابِ شریعت سے منھ نہیں موڑتے ۔حضرت جنید بغدادیؒ کا جب وقتِ آخر ہوا،ضعف کا عالم طاری تھا،حسبِ حکم ایک صاحب وضو کرانے میں مشغول ہوئے ،عجب اتفاق کہ وہ صاحب ریشِ مبارک میں خلال کرانا بھول گیے۔ آپ نے خود سے ان کا ہاتھ پکڑا اور اس سنت کو پورا کیا ۔حاضرین نے عرض کی کہ اے میرے دین کے سردار ایسے نازک وقت میں تو اس قدر تکلیف کی اجازت نہیں ۔آپ نے کہا: سچ ہے،مگر یہ بھی تو دیکھو کہ اللہ کس کی بدولت ملا ۔اسی شریعت ورزی نے وہاں تک پہنچایا۔ بیشک جو اہل کمال ہوتے ہیں ان کی یہی روش رہی ہے۔البتہ اہل غرور تھوڑی بات میں بھول جاتے ہیں ،ان کا عجب حال ہے ،جس چیز کو نہیں دیکھتے ہیں ،سمجھتے ہیں کہ وہ چیز ہی نہیں ہے ۔کیا نماز کے اسرار کو جاننا کھیل تماشا ہے ۔بڑے بڑے حقیقت آشنا بھی نہیں جانتے کہ پانچ وقت کی نماز کیوں ہوئی ؟تکبیر تحریمہ وقیام وقعود اور دیگر ارکان کیوں مقرر کیے گیے اور یہ ترتیب کیوں رکھی گئی کہ صبح کی نمازِ فرض دو رکعت ،ظہر وعصر کی نماز فرض چار چار رکعت ،مغرب کی نماز فرض تین رکعت ،عشاء کی نماز فرض چار رکعت اور رکوع ایک بار،سجدہ دو بار۔ ہر بات میں ایک بھید اور خاصیت ہے ۔باوجود حصولِ کمال اگر نماز کی پابندی نہ ہوگی تو کوئی کمال وقت پر کام نہ آئے گا۔ بے نمازی صوفی موت کے وقت جب اپنی حالت خراب دیکھتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں کہ ہائے وہ کمال کیا ہوگیا۔جواب ملتا ہے کہ مسمار نہ تھا جڑ ہل گئی ۔ابلیس کے ساتھ کیا ہوا؟یہی ہوا کہ سارا کمال ایک نافرمانی کھو بیٹھی۔ یہی وہ گھاٹی ہے جہاں سالک مغرور ہوکر لٹ جاتے ہیں اور اصلی راز ان پر نہیں کھلتا'' ۔[۳۰]

شریعت ،طریقت اور حقیقت کی تطبیق

شریعت وطریقت کے معانی علماوصوفیا کے درمیان الگ الگ رہے ہیں۔ایک جماعت نے دونوں کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا ہے ،جب کہ دوسری جماعت نے دونوں کو ایک خانے میں رکھا ہے۔ دونوں گروہ افراط وتفریط کے شکار نظر آتے ہیں اور ان

کے معانی ومفاہیم کے ادراک میں غلطی پر ہیں۔شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے بڑی حد تک اس اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور شریعت وطریقت کی بہترین تفہیم و ترجمانی کی ہے۔ان کے مطابق شریعت سے طریقت اور طریقت سے حقیقت حاصل ہوتی ہے۔علم حقیقت تین چیزوں پر مشتمل ہے:

۱۔ خداوند تعالیٰ کی ذات اور وحدانیت کا علم۔

۲۔ خداوند تعالیٰ کی صفات اور اس کے احکام کا علم۔

۳۔ اس کے فعل اور حکمت کا علم۔

یہ چیزیں معلوم ہوجاتی ہیں تو ایک سالک عارف کہلاتا ہے۔مگر حقیقت بغیر شریعت کے زندقہ اور شریعت بغیر حقیقت کے نفاق ہے۔اس کے بعد شیخ لکھتے ہیں:

''جو شریعت کی راہ کی پروا نہیں کرتے اور اہل حقیقت بن بیٹھتے ہیں، دعویٰ ان کا یہ ہے کہ جب حقیقت منکشف ہوگئی تو شریعت کی ضرورت کیا باقی رہی۔نعوذ باللہ من ذالک، یہ مذہب ملحدانہ ہے۔ایسے مذہب واعتقاد پر خدا کی پھٹکار ہو.....بغیر شریعت ورزی اہل حقیقت ہونے کا دعویٰ کرنا سراسر زندیقیت ہے اور حقیقت سے بے خبر رہ کر صاحب شریعت بن جانا شانِ منافقانہ ہے۔دراصل دونوں لازم ملزوم ہیں''۔[۳۱]

علما اور صوفیا کے درمیان ہر زمانے میں تصادم رہا ہے۔علما نے صوفیا پر یہ الزام عائد کیا جو کسی حد تک درست بھی تھا کہ وہ دین کی صحیح نمائندگی نہیں کررہے ہیں جس سے شریعتِ اسلامی کی بنیادیں متزلزل ہورہی ہیں۔جب کہ صوفیا علما سے بعد اس لیے اختیار کرتے تھے کہ وہ اسلامی علوم وعقائد کی تفہیم واشاعت میں کاہلی وسستی سے کام لیتے ہیں۔لیکن یہ تصادم بالخصوص شیخ شرف الدین کے یہاں نظر نہیں آتا۔ان کی مجلس میں نہ صرف اصحابِ حال شریک ہوتے، بلکہ اصحابِ قال بھی بڑی تعداد میں آتے تھے۔دونوں نے مل کر اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں اچھی مثالیں قائم کی ہیں۔دونوں نے ایک دوسرے سے بعض معاملات میں بڑی کشادہ دلی سے ربط وضبط رکھا اور مفید لائحہ عمل تیار کیا، جس سے اسلام کی اشاعت اور اسلامی علوم کے فروغ کے راستے ہموار ہوئے ہیں۔[۳۲]

شیخ کے اثرات و فیوض ہندوستان کے طول وعرض میں

شیخ شرف الدین کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی خدمتِ خلق اور انسانیت کو معراج پر پہنچانے کے لیے وقف کردی تھی۔ شیخ نجیب الدین فردوسی کے حلقہ میں داخل ہونے تک انہوں نے اس راہ کی دشواریوں اور پریشانیوں کو برداشت کرنے کے لیے خود کو تیار کیا۔ اس کے بعد جب انہوں نے شیخ کے حکم سے وطن کی طرف مراجعت کی، 'بہیہ' کے جنگل میں جس طرح اور جتنی مدت تک روپوش رہے، اس سے بھی یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس گھنے جنگل میں اپنی زندگی کا اہم حصہ اس لیے گزارا کہ خواہش نفس اور حب دنیا و مال ومتاع سب کچھ ان کے نزدیک بے معنیٰ ہوکر رہ جائے اور ان کا اٹھنا، بیٹھنا، جینا، مرنا سب اسی خالقِ حقیقی کے لیے ہو جو اس کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کا صانع اور پیدا کرنے والا ہے۔ یہی وہ تعلق باللہ اور نصرتِ خداوندی تھی کہ اللہ نے آپ کو بڑی مقبولیت سے نوازا اور آپ کے اردگرد لوگوں کی بھیڑ لگی رہی اور غائبانہ بھی آپ کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد ہے جو آپ سے استفادہ کی مشتاق تھی۔ آپ نے مسلک ومشرب کا خیال کیے بغیر ہر ایک کو فیض پہنچانے کی کوشش کی اور آپ کے سینۂ مبارک میں جو نورِ الٰہی چھپا ہوا تھا اس کے عکس جمیل وجلیل سے بے شمار لوگوں نے روحانی وقلبی سرور حاصل کیا۔ ایک لاکھ سے زائد انسان آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، جن میں کم سے کم تین سو آدمی عارف کامل اور واصل بحق ہوئے۔ ۳۳ ان کے علاوہ بہت سے وہ لوگ بھی ہیں جو کسی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکے اور براہ راست استفادہ کرنے سے قاصر رہے تو ان کو آپ نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ تعلیم دی اور ان کی اصلاحِ باطن فرمائی۔

شیخ کے فیوض و برکات اور اثرات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں شیخ نے سلسلۂ فردوسیہ کی بہار میں اشاعت کی اس وقت ہندوستان میں کئی سلسلے اپنے کام میں مصروف تھے جن میں اہم سلسلۂ چشتیہ تھا مگر وہ بھی مختلف ذیلی سلسلوں میں بٹ چکا تھا اور ہر شاخ الگ الگ علاقوں مصروف کار تھی۔ اس کے برعکس فردوسی

سلسلہ ہی ایک ایسا سلسلہ تھا جو منظّم تھا اور پورے صوبۂ بہار میں لوگوں کے قلوب پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرکے ان کی دینی و مذہبی روح کو زندہ وتابندہ کررہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ اب بھی بہار میں موجود ہے اور اس سلسلے کے بزرگ بعض علاقوں میں تربیتِ خلق میں مصروف نظر آتے ہیں۔

حوشی ومراجع

۱۔ سیرۃ الشرف، سید ضمیر الدین، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۴ء (جدید ایڈیشن) ص:۴۰
۲۔ سیرۃ الشرف ص:۴۳-۴۴
۳۔ تاریخ دعوت وعزیمت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو ۲۰۰۰ء، ج:۳ ص:۱۷۹
۴۔ سیرۃ الشرف ص:۴۵
۵۔ بزم صوفیا، سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص:۴۰۰
۶۔ سیرۃ الشرف ص:۵۰
۷۔ سیرۃ الشرف ص:۵۳-۵۴
۸۔ مناقب الاصفیا، غلام سرور لاہوری، مطبع نورالآفاق، کلکتہ، ص:۱۳۲، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۳، ص۱۸۴
۹۔ مناقب الاصفیا، ص:۱۳۲، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۳ ص۱۸۴
۱۰۔ خبارالاخبار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (مترجم: غلام معین الدین) فرید بک ڈپو، دہلی ص:۱۵۲
۱۱۔ سیرۃ الشرف ص:۶۵
۱۲۔ بزم صوفیا ص:۴۰۸
۱۳۔ مکتوبات صدی ص:۱۶
۱۴۔ سیرۃ الشرف ص:۱۸۵
۱۵۔ سیرۃ الشرف ص:۱۶۶-۱۶۷
۱۶۔ سیرۃ الشرف ص:۱۸۷
۱۷۔ سیرۃ الشرف ص:۱۸

۱۸ تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۳،ص:۲۳۹

۱۹ بزم صوفیا،ص:۴۳۳۔۴۵۲

۲۰ تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۳،ص:۲۴۰

۲۱ تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۳،ص:۱۴۴-۲۴۵

۲۲ بزم صوفیا،ص:۴۳۵۔

۲۳ تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۳،ص:۲۹۸-۲۹۹

۲۴ بزم صوفیا،ص:۴۱۰

۲۵ سیرت الشرف،ص:۱۸۷-۱۸۸

۲۶ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمن مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء، ص:۱۰۷

۲۷ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۱۰۷

۲۸ مکتوبات صدی (مکتوب نمبر:۱۷) ص:۱۳۹-۱۴۰

۲۹ مکتوبات صدی (مکتوب نمبر:۱۷) ص:۱۴۰-۱۴۲

۳۰ مکتوبات صدی (مکتوب نمبر:۱۷) ص:۱۴۲-۱۴۳

۳۱ مکتوبات صدی (مکتوب نمبر:۲۶) ص:۱۹۶

۳۲ سیرۃ الشرف،ص:۱۹۰-۱۹۱

۳۳ سیرۃ الشرف،ص:۱۹۰-۱۹۱

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی انگریزی مطبوعات

		صفحات	قیمت
	از مولانا صدر الدین اصلاحی		
۱	Islamic Civilization in its Real Prespective	۱۳۸	۹۰
۲	How to Study Islam?	۲۲	۲
۳	Pitfalls on the Path of Islamic Movement	۳۴	۴
۴	The Islamic Economic Order	۵۰	۷
۵	Muslims and Dawah of Islam	۲۸	۲
	از مولانا سیّد جلال الدین عمری		
۱	Women and Islam	۱۰۴	۲۵
۲	Muslim Woman: Role and Responsibilties	۶۴	۲۰
۳	The Rights of Muslim Women: An Appraisel	۲۳۴	۷۰
۴	The Concept of Social Service in Islam	۱۶۵	۵۰
۵	Islam and The Unity of Mankind	۳۶	۷
۶	Islam: The Religion of Dawah	۳۲	۳
۷	Islam: The Universal Truth	۲۲	۳

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

ترجمہ و تلخیص

معاصر حکام کے بارے میں امام مالکؒ کا معتدل موقف

ڈاکٹر توفیق بن احمد الغلبز وری

ترجمہ: ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

احادیث میں حکم رانوں کی سمع وطاعت پر زور دیا گیا ہے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حکامِ وقت کی اطاعت کی جائے، خواہ وہ ظلم کریں اور عوام کے حقوق پامال کریں۔ ان احادیث کی بنیاد پر علمائے متقدمین نے مسلم حکم رانوں کے خلاف خروج کو غلط قرار دیا تھا، خواہ وہ بہ زور قوت اقتدار پر قابض ہوئے ہوں۔

ان احادیث اور ان کی قدیم تشریحات کی بنیاد پر ہمارے تجزیہ نگار گذشتہ اور موجودہ سیاسی پس منظر کے فرق کے بارے میں اس عوامی احساس (جس میں دینی اور لادینی کی تمیز نہیں) کو مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں کہ:

۱- موجودہ زمانہ کے متغلّب حکمراں (خواہ انھوں نے غیر آئینی طریقوں سے حکومت و اقتدار پر قبضہ کیا ہو یا موجودہ معمول کے مطابق جمہوری دھاندلیوں سے) وقت حاضر کی زور آزما غیر ملکی طاقتوں کے زر خرید غلام (کُھلے ایجنٹ) معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی وفاداریاں ملک وقوم کے بجائے غیر ملکی شہ زور طاقتوں کے مفادات و ترجیحات سے علانیہ طور پر وابستہ دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا جو بیرونی دشمنوں کا حکم ہو وہی ان کے PLANTED ملکی حکمرانوں کا ہونا چاہئے۔

گذشتہ زمانہ کے متغلّب حکمراں اپنے ذاتی مفاد کی حد تک جتنے بھی خود غرض رہے ہوں، لیکن قومی وملکی مفادات کے محافظ ونگہبان کے روپ میں ہمیشہ ملک وقوم کے سچے وفادار ہیرو بنے رہتے تھے۔

۲- گذشتہ اور موجودہ زمانوں کی جنگوں کے مقاصد میں بھی زمین وآسمان کا فرق ہوچکا ہے۔ قدیم جنگوں کا مقصد دیگر اقوام کے علاقوں کو فتح کرکے ان کے محصولات پر قبضہ یعنی خالص مادی توسیعی مفاد ہوتا تھا۔

موجودہ زمانہ کی سرد جنگ ہو یا گرم، یہ ٹوٹل جنگ کا زمانہ ہے جس میں مذکورہ مادی فوائد کے علاوہ علمی وفکری، ثقافتی وتہذیبی اور مقامی رسم ورواج حتّٰی کہ لباس، کھانا پینا، رہن سہن الغرض کُل معاشرت کی تبدیلی مطلوب ہے، تاکہ فاتح ومفتوح میں مَن و تو نہ رہے اور مفتوح علاقہ میں سامراجی مقاصد کو ابدی حیثیت دی جاسکے۔

۳- قدیم جنگوں میں علاقے فتح کیے جاتے تھے، دل و دماغ فتح کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی، موجودہ جنگوں میں سامراجی مقاصد کو ابدی حیثیت دینے کے لئے دل و دماغ کو فتح کرنا بھی مقصود ہے، تحریص و ترغیب کے ذریعہ ہو تو فبہا، ورنہ عالمی دہشت گردوں کے پاس ترہیب وتعذیب کے ایسے ایسے سائنسی، مشینی آلات و وسائل اور نفسیاتی حربے موجود ہیں جن کو آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا، نہ دل میں ان کا وہم وگمان گذرا!

حاصل کلام یہ کہ موجودہ زمانہ کی عالمی/ ریاستی سرکاری پیچیدہ دہشت گردی کے تجزیہ کے لیے ہر پہلو سے مکمل صورت حال اور اس کے مالہٗ و ماعلیہ کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ملکی وقومی آزادی کے متوالوں اور دینی و مذہبی غیرت وحمیت کے لیے سر پر کفن باندھے ہوئے سرفروشوں کو صرف قرآن وحدیث اور سیاق وسباق سے علیٰحدہ ان کی قدیم تشریحات کے حوالہ سے امن وآشتی اور صبر کی تلقین کافی نہیں۔ واللہ اعلم (مترجم)

اس موضوع پر اظہار خیال کی وجہ وہ فتنہ ہے جس کو بعض غالی نوجوانوں نے گذشتہ برسوں میں عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں برپا کر رکھا ہے۔ ان کی بدعت اور گمراہی کی دو وجوہ ہیں: اول تکفیر، دوم حکام کے خلاف خروج۔ ان وجوہ سے بڑے مفاسد پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے بڑے بزرگ علماء، جن میں سرفہرست دارِ ہجرت مدینہ منورہ کے امام مالکؒ ہیں، ان کے طریق کار سے لوگوں کو واقف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

حکام کے بارے میں اہلِ سنت و جماعت کا طریقہ

اہلِ سنت و جماعت کے عقیدہ کا اصول بیان کرتے ہوئے امام طحاویؒ نے چاروں متفقہ اماموں، جن میں امام مالکؒ بھی ہیں، کا معتدل طریقہ واضح کیا ہے۔ وہ

لکھتے ہیں: ''سوائے اس کے جس پر تلوار کی سزا واجب ہے ہم محمد ﷺ کی امت کے کسی فرد کے خلاف تلوار اٹھانا صحیح نہیں سمجھتے اور ہمارے ائمہ وحکمران اگرچہ ظلم کریں، ہم ان کے خلاف خروج☆ (بغاوت) صحیح سمجھتے ہیں نہ ان کے خلاف بد دعا کرتے ہیں، نہ ان کی اطاعت سے دست کش ہوتے (بیعت توڑتے) ہیں، بلکہ ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح فرض جانتے ہیں جب تک کہ وہ معصیت کا حکم نہ دیں، اور ان کے لئے عافیت وصلاح کی دعا کرتے ہیں، سنت و جماعت کی اتباع کرتے ہیں اور شذوذ، اختلاف وتفرقہ بازی سے بچتے ہیں''۔[1]

اسی صحیح اعتقاد اور راست طریق کار پر امام مالکؒ کاربند تھے جیسا کہ ان کی سیرت وطریقہ کار اور درج ذیل خیالات سے ثابت ہوتا ہے:

۱- حکام کے خلاف خروج صحیح نہیں، خواہ وہ ظالم ہوں:

امام مالکؒ نے اپنی زندگی میں دو ایسی اسلامی حکومتوں (اموی وعباسی) کے عہد کو دیکھا جس میں اسلامی رقبہ کی بے نظیر توسیع ہوئی۔ وہ ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے، اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان تخت حکومت پر متمکن ہوا، پھر عمر بن عبدالعزیزؒ کا انتخاب ہوا، جن کو امام مالکؒ اس حد تک پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے کہ انھوں نے ان کی سیرت بیان کی، جس کو ان کے بعض شاگردوں نے روایت بھی کیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد اموی وعباسی خلفاء نے ان سے مختلف راستہ اختیار

---

[1] موجودہ زمانہ کے جمہوری تماشے میں نمائندہ انتخابات کے بعد حکمراں پارٹی یا پارٹیوں کے اتحاد کی آئینی حکومت کے وقفۂ حکمرانی کے دوران اپوزیشن (مخالف جماعتوں) کا اس سے مستقل عدم تعاون اور مسلسل فتنہ وفساد برپا رکھنا اور پھر آئندہ انتخابات کے موقع پر اس طرح کی ضدّم ضدّا کہ غیر جانب دار مشاہدین یہ خیال کرنے لگیں کہ اصلاحات کے مطالبہ کا اصل مقصد سنہرے طشت میں سجا کر حکومت عطا کرنا ہے، مترجم کے نزدیک ہنگامہ آرائی کی یہ تمام قسمیں خروج ہی کی مختلف شکلیں ہیں، جن کو بیرونی چال باز نہ صرف بڑھاوا دے رہے ہیں، بلکہ ملکی خائن غدّاروں کے بل بوتے پر ملک کے ملک ہضم کرنے کے لئے پر تول رہے ہیں-مترجم

کیا، ان خلفاء کے زمانہ میں امام مالکؒ نے خوارج کے خروج اور علویوں کے حملوں سے امت اسلام کو پہنچنے والے ناقابلِ تلافی نقصانات کا مشاہدہ کیا۔ اس ہنگامہ آرائی کے زمانہ میں انھوں نے دیکھا کہ نظم ونسق اضطراب وانتشار کا شکار ہوا، لوگوں کے حالات دگرگوں ہوگئے، حرمات کا پاس ولحاظ نہ رہا، جان ومال اور عزت وآبرو خطرہ میں پڑ گئے، صرف تھوڑی دیر کے ہنگامہ میں ایسے ایسے مظالم ومفاسد کا ارتکاب ہوا جو منظّم مظالم کے دور میں برسوں کے عرصہ میں نہ ہو سکے۔[۲]

لہذا امام مالکؒ ظالم حکام کے خلاف بھی خروج کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، اس لئے کہ اس کا مطلب فتنہ پروری اور حرام خون بہانے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، بلکہ امام مالکؒ تو تلوار کے بَل پر زور زبردستی سے غلبہ حاصل کر لینے والے سلطان کی بیعت کو بھی صحیح سمجھتے تھے، جیسا کہ ان کے شاگرد یحییٰ بن یحییٰ اللیثی المصمودی الاندلسی نے روایت کی ہے، امام شاطبیؒ کی کتاب 'الاعتصام' میں مذکور ہے: ''یحییٰ بن یحییٰ سے کہا گیا کہ کیا تغلّب والی بیعت (یعنی جسے بذریعہ قوت حاصل کیا گیا ہو) مکروہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں۔ پھر ان سے کہا گیا: خواہ وہ امام ظالم ہوں؟ انھوں نے فرمایا: حضرت ابن عمرؓ نے عبدالملک بن مروان سے بیعت کی تھی، حالاں کہ اس نے تلوار کے بَل پر حکومت حاصل کی تھی، یہ بات مجھ کو امام مالکؒ نے ابن عمرؓ کے حوالہ سے بتائی کہ انھوں نے عبدالملک کو لکھا: کتاب اللہ اور اس کے نبی حضرت محمد ﷺ کی سنت کے مطابق میں تمھارے لیے سمع واطاعت کا اقرار کرتا ہوں۔ یحییٰ نے (مزید) کہا: بیعت افتراق سے بہتر ہے۔ یحییٰ نے (پھر) کہا: امام مالکؒ کے پاس العمری آئے اور ان سے کہا: اے ابوعبداللہ! اہل حرمین (شریفین) نے مجھ سے بیعت کرلی ہے، نیز آپ کو ابوجعفر کی سیرت کا حال معلوم ہے، تو اب بتائیے آپ کا کیا خیال ہے؟ امام مالکؒ نے عمری سے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ کسی نیک آدمی کو ولایت (حکومت) سپرد کرنے سے عمر بن عبدالعزیزؒ کو کس چیز نے روکا؟ عمری نے کہا: مجھے علم نہیں۔ امام مالکؒ نے فرمایا: لیکن مجھے علم ہے۔ بات یہ تھی کہ ان کے بعد یزید کی بیعت تو ہو چکی تھی، اب عمر بن عبدالعزیز کو اندیشہ ہوا کہ اگر انھوں نے کسی نیک آدمی کو

والی (حاکم) بنایا تو یزید کے سامنے اس کے خلاف قیام (جنگ) کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوگا، اس لیے جنگ ہوگی اور ایسا فساد برپا ہوگا جس کی اصلاح نہ ہوسکے گی۔ یہ بات سن کر عمری نے امام مالکؒ کی رائے سے اتفاق کیا''۔[۳]

یہ روایت نقل کرکے امام شاطبیؒ نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے: ''اس روایت سے یہ ظاہر ہے کہ اگر غیر مستحق کو معزول کرکے مستحق کو حاکم بنانے سے فتنہ اور ناقابلِ اصلاح مفاسد کے واقع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس (بہتر) کام کو ترک کردینے میں ہی مصلحت ہوتی ہے۔[۴]

یہ امام مالکؒ اور ان کے شاطبیؒ جیسے متبعین کی اعتدال پسندی ہے کہ معاملہ کو مصلحت کے لحاظ سے اعتدال و توازن کے مطابق طے کیا۔ یہی بات شرعی نصوص اور مقاصد سے میل کھاتی ہے۔ اسی لیے شاطبیؒ نے اسے امام مالکؒ کا اصل مسلک شمار کیا ہے۔

امام مالکؒ اہل سنت و جماعت کا دامن تھامے رہے، انھوں نے امام کے خلاف خروج کو مناسب سمجھا نہ بغاوت کی دعوت دی، نہ اس کی تائید کی۔ ساتھ ہی انھوں نے معاصر خلفاء و حکام کی طرف بھی لوگوں کو دعوت نہ دی اور ان کی حمایت نہیں کی، بلکہ غیر جانب داری کی پابندی کی۔ یہ بات اسلام کی اعتدال پسندی اور مقاصدِ شریعت دونوں سے میل کھاتی ہے۔ التزام جماعت کے ساتھ انھوں نے حکمرانوں کی اطاعت کی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حکمرانوں کی سیاست کو اسلامی احکام اور قرآنی ہدایات کے مطابق سمجھتے تھے، بلکہ حکام کی اطاعت پر وہ اس لیے راضی رہتے تھے کہ اس میں نسبتاً اصلاح کا پہلو غالب رہتا ہے۔ اس صورت میں حق بات کہنے اور احسن طریقہ سے نصیحت و موعظت کرنے سے اصلاح کا امکان موجود رہتا ہے۔ چونکہ اکثر محکوم (رعایا) کی اصلاح سے حکّام کی اصلاح ہوجاتی ہے، اس لیے علماء پر واجب ہے کہ محکومین (عوام) کی رہنمائی اور اصلاح کی کوشش کریں، اس لئے کہ ان کی اصلاح کی بدولت حکّام کی بھی اصلاح ہوجائے گی۔ بہر حال اصلاح کے طریقہ سے متعلق ان کی جو رائے بھی ہو مگر وہ اندھے فتنوں کے وقت کسی فریق کی بھی مدد نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ دونوں فریق گناہ

کا ارتکاب کرنے والے تھے، لہذا کسی کے ساتھ دوسرے کے خلاف تعاون نہیں کرتے تھے۔ خوارج کے بارے میں کسی نے ان سے سوال کیا کہ کیا ان سے جنگ جائز ہے؟ تو جواب دیا: ہاں اگر وہ عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے حاکم کے خلاف خروج کریں۔ سوال کرنے والے نے پھر کہا: اگر ان جیسا حاکم نہ ہو؟ فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کو ایک ظالم کے ذریعہ دوسرے ظالم سے انتقام لینے دو، پھر وہی دونوں سے انتقام لے گا۔ ۵

شیخ محمد ابوزہرہؒ کا خیال تھا کہ ظالم حکام کے خلاف خروج کے عدم جواز کے بارے میں امام مالکؒ کا مسلک حسن البصریؒ کے مثل ہے۔ دونوں کے یہاں اگر چہ الفاظ مختلف ہیں، لیکن معنٰی ومطلب ایک ہے۔ ۶ دونوں علماء کی بات سنت کی نصوص، شریعت کے مقاصد اور اہلِ سنت و جماعت کے اصولوں کے موافق ہے، اس لیے کہ ان کے خلاف خروج میں ان کے ظلم وجور سے کئی گنا زیادہ مفاسد مرتب ہوتے ہیں۔

شیخ ابوزہرۃ کی اس رائے پر، کہ ظالم حکام کے خلاف خروج صحیح نہیں ہے، استاذ علال الفاسی نے تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امام مالکؒ سے اس طرح کی کوئی بات منقول ہے نہ ان کے کلام میں کوئی چیز اس پر دلالت کرتی ہے۔ ۷ لیکن میرے خیال میں شیخ ابوزہرۃ کی رائے صحیح ہے، اس لیے کہ امام مالکؒ نے مؤطا میں ''خوشی ناخوشی ہر حالت میں حکامِ عصر کی اطاعت'' سے متعلق جن نصوص کی تخریج کی ہے ان سے مذکورہ بالا رائے کی تائید ہوتی ہے۔ اسی طرح خروج سے انکار، بلکہ اس سے متعلق امام شاطبی کا نقل کردہ فتوی بھی، جس کا ذکر پہلے گذر چکا، مذکورہ رائے کی صحت کی دلیل ہے۔

۲- حکام کے خلاف باغی خوارج کے بارے میں سخت رائے:

امام مالکؒ نے حجاز میں خوارج کے فتنہ کو اس وقت دیکھا جب ان کی عمر چالیس برس کے قریب ہو رہی تھی۔ خوارج اور اہلِ مدینہ منورہ کے درمیان ایک معرکہ کے بعد ابوحمزہ خارجی نے ۱۳۰ھ میں اپنے گروہ کے ساتھ مدینہ پر ہلّہ بول دیا جس میں قریش کی بڑی تعداد کا قتل عام ہوا اور یہ گھناؤنا فتنہ وفساد عین حرم نبویؐ میں ہوا جس کے احترام میں

امام مالکؒ کبھی سواری پر نہیں چلتے تھے۔انھوں نے یہ سب دیکھا تو مدنی اسلاف میں سے اپنے شیوخ کے طریقہ کے مطابق خروج اور خوارج کی مذمت کی، ان سے اور ان کے طریقوں سے لوگوں کو نفرت دلائی اور سنت و جماعت کے التزام پر ان کو آمادہ کیا۔ ان کے بارے میں امام مالک کے خیالات کے چند نمونے یہاں تحریر کیے جاتے ہیں:

☆ ابن القاسم نے کہا: مجھ سے امام مالکؒ نے اباضیہ، حروریہ اور دیگر اہل اُھواء کے بارے میں فرمایا: ''میرا خیال ہے کہ ان سے توبہ کرائی جائے، اگر توبہ کرلیں تو ٹھیک، ورنہ قتل کردیے جائیں''۔۸

☆ ابن القاسم نے کہا: مجھ سے امام مالکؒ نے قدریہ اور اباضیہ کے بارے میں فرمایا: ''ان کی میّتوں پر نماز جنازہ پڑھی جائے نہ ان کے جنازوں میں شرکت کی جائے اور نہ ان کے مریضوں کی عیادت کی جائے''۔۹

☆ سحنون نے ابن القاسم سے کہا: ان خوارج کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے جنھوں نے خروج کیا، خون بہائے، مال و دولت لوٹے، پھر توبہ کی اور (بداعمالیوں سے) رجوع کیا؟ ابن القاسم نے جواب دیا: ان کے بارے میں امام مالکؒ نے فرمایا ہے: ان کے خون معاف کردیے جائیں، لوٹے ہوئے مال و دولت میں سے ان کے پاس جو چیز بعینہٖ مل جائے اس کو واپس لے لیا جائے، ورنہ اس کے بدلے ان کے اپنے ذاتی اموال نہ لیے جائیں، اس لیے کہ انھوں نے تاویل کی بنیاد پر لوٹے ہوئے مال و دولت کو خرچ کرڈالا''۔۱۰

☆ العتبی نے ''المستخرجة'' میں کہا: ''اباضیہ اور واصلیہ کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں امام مالکؒ سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: ''میں اس کو پسند نہیں کرتا''۔ ان لوگوں کے علاقوں میں ان کے ساتھ سکونت اختیار کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ''اس کا ترک مجھے زیادہ پسند ہے''۔۱۱ عتبی نے مزید کہا کہ امام مالکؒ نے فرمایا: ''جب دونوں حَکم حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے فیصلہ سنایا تو خوارج نے خروج کیا اور کہا: **لا حکم إلا للّٰہ** (اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا حکم قابلِ

اعتبار نہیں)۔حضرت علی بن ابی طالبؓ کو ان لوگوں کا علم ہوا تو فرمایا: وہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ ان کو خوارج کا قول بتایا گیا تو فرمایا: حق بات کے ذریعہ باطل چاہا جارہا ہے۔امام مالکؒ نے فرمایا: یہ پہلا گروہ ہے جو سنت و جماعت سے باہر نکلا۔مزید فرمایا: ''میرا خیال ہے کہ انھوں نے حد سے تجاوز کیا اور لوگوں کی تکفیر کی''۔[۱۲]

☆ابن رجب نے خوارج کے بارے میں کہا:..... ان کے بارے میں بعض اہل علم کا قول ہے کہ مسلمانوں کا خون بہانے، ان کی تکفیر کرنے اور زمین میں فساد پھیلانے کے جرم میں (خوارج) قتل کیے جائیں گے، یہ امام مالکؒ کا قول ہے''۔[۱۳]

۳- حکام کو وعظ ونصیحت کرنا واجب ہے:

امام مالکؒ سمجھتے تھے کہ خروج و بغاوت کے بجائے علماء وفقہاء پر حکام کی وعظ و نصیحت اور رہنمائی و اصلاح واجب ہے، اس لیے وہ خود امراء وخلفاء کے پاس آتے جاتے اور اہلِ سنت و جماعت کے طریقہ کے مطابق ان کو نصیحت و رہنمائی کرتے، خیر کی دعوت دیتے اور برائی سے ہوشیار کرتے تھے۔میانہ روی اور اعتدال کا یہی راستہ ہے۔

بعض ناواقف لوگ سلاطین کے پاس دینی نصیحت کے لیے بھی علماء کی آمد و رفت پر نکیر کرتے ہیں۔امام شوکانیؒ نے اپنی کتاب **رفع الأساطین فی حکم الاتصال بالسلاطین** میں ان لوگوں کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے: ''کسی باعقل وہوش مند آدمی سے یہ بات مخفی نہیں کہ اگر اہل علم و دین فضلاء بادشاہوں کے پاس آمد و رفت سے باز آجائیں تو شریعت معطل ہوکر رہ جائے گی اور دین ومعاملات کے شرعی احکام کے بارے میں اسلامی مملکت جاہلی مملکت میں بدل جائے گی، جہالت عام ہوگی، بادشاہ اور اس کے خاص حاشیہ برداروں وتبعین کی طرف سے کتاب وسنت کے احکام کی علانیہ مخالفت ہونے لگے گی، اس طرح ان کی خواہشات کے مطابق ان کا مقصد پورا ہوگا اور وہ دین اسلام میں جیسے چاہیں گے الٹ پھیر اور ظاہری مخالفت کریں گے، دوسروں کے مال و دولت مباح کرلیے جائیں گے، عصمتیں پامال ہوں گی، مساجد و مدارس معطل ہوجائیں

گے، حرمات کا پاس ولحاظ اٹھ جائے گا، شعائر اسلام ختم ہو جائیں گے، خاص کر ان ملوک و حکم رانوں کی طرف سے جو یہ سب اپنی حکومت و دولت کے چھن جانے اور عزت و ناموس کی بے آبروئی کے خوف سے کرتے ہیں، بیش تر اسلامی احکام سے دامن چھڑانے کا بڑا بہانہ ان کے لیے یہی ہوتا ہے کہ ہم کو واقفیت نہیں، کوئی ہم کو سکھانے والا نہیں، کوئی ہم کو راہ دکھانے والا نہیں، دین جاننے والے ہم سے دور ہو گئے، باعمل علماء نے ہم سے راہ فرار اختیار کی''۔[۱۴]

اہل سنت و جماعت کے اس معتدل منہج کی روشنی میں امام مالکؒ اپنے زمانہ کے حکام سے ربط و تعلق رکھتے تھے اور علماء وفقہاء کو حکم رانوں کی نصیحت و رہنمائی کے لیے ان کے پاس آمد و رفت پر آمادہ کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے: ''ہر مسلمان یا وہ شخص جس کے سینہ میں اللہ نے علم اور فقہ دی ہے اس پر واجب ہے کہ وہ ہر صاحبِ اقتدار کے پاس جائے، اس کو بھلائی کا حکم دے، برائی سے روکے اور نصیحت کرے، تاکہ عالم کی آمد غیر عالم سے علیحدہ معلوم ہو، اس لیے کہ عالم حکم رانوں کے پاس اسی مقصد سے جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی فضل واحسان نہیں''۔[۱۵]

امام مالکؒ سے ان سے شاگرد خلف بن عمر نے کہا: ''امراء حکام کے پاس آپ کی آمد و رفت کے بارے میں لوگ چہ می گوئیاں کرتے ہیں''۔ امام مالکؒ نے جواب دیا: ''میں ان کے پاس اپنے نفس پر جبر کر کے جاتا ہوں، وہ بھی اس لیے کہ کہیں نامناسب آدمی سے مشورہ نہ لیا جانے لگے''۔[۱۶] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پاکیزہ مقصد یعنی اُمر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے دل پر جبر کر کے حکام کے پاس آنے جانے کی زحمت گوارا فرماتے تھے۔ حکّام کے خلاف لوگوں کو ورغلانے کے بجائے خاموشی سے ان کو نصیحت کرنے اور مفسدین کے فساد کا راستہ بند کرنے کے لیے بااقتدار لوگوں کے پاس آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ یہی اعتدال اور میانہ روی کا تقاضا ہے جس پر اہل سنت کاربند ہیں۔ امام مالکؒ فرماتے تھے: ''اگر میں ان حکام کے پاس نہ جاؤں تو اس شہر (مدینہ منورہ) میں نبی ﷺ کی کسی سنت پر عمل نہ ہو''۔[۱۷]

حکّام کو وعظ ونصیحت کی ایک مثال عتیق بن یعقوب نے اس طرح روایت کی ہے: ''امام مالک جب حکم رانِ وقت کے پاس تشریف لے جاتے تو اس کو نصیحت کرتے اور مسلمانوں کے مصالح (مفاد کے کاموں) کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ ایک روز خلیفہ ہارون الرشید کے پاس گئے تو اس کو مسلمانوں کے فائدہ کے کاموں کے لیے آمادہ کرتے ہوئے فرمایا: ''مجھے روایت پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ اپنے فضل اور بزرگی کے باوجود عام الرمادۃ (قحط کے سال) کے دوران (محتاجوں کے چولھوں پر چڑھی ہوئی) دیگچیوں کے نیچے پھونک پھونک کر آگ جلایا کرتے تھے تو آپ کی داڑھی میں سے دھواں نکلنے لگتا تھا، لیکن تم سے ایسے (محنت ومشقت کے) کاموں کے بغیر ہی لوگ راضی ہیں''۔ ۱۸

ایک بار امام مالکؒ ہارون الرشید کے پاس گئے تو دیکھا کہ اس کے سامنے شطرنج رکھی ہوئی ہے، اور وہ (چال کے لیے) غور وفکر میں محو ہے۔ وہ بیٹھے نہیں، کھڑے رہے اور فرمایا: اے امیر المؤمنین! کیا یہ حق (صحیح) ہے؟ ہارون نے کہا: نہیں۔ امام مالکؒ نے فرمایا: اگر حق نہیں ہے تو پھر گمراہی کے سوا کیا ہے؟ ہارون الرشید اٹھ گئے اور کہا: اب آئندہ یہ میرے سامنے نہیں رکھی جائے گی۔

ایک روز امام مالکؒ نے حکمرانِ وقت سے فرمایا: ''رعایا کے حالات کی خبر رکھو اس لیے کہ تم ان کے ذمہ دار ہو، حضرت عمر بن الخطابؓ فرمایا کرتے تھے: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر فرات کے کنارہ کوئی اونٹ ہلاک ہوجائے تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ کہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھ تاچھ نہ فرمائے''۔

الکنینی نے کہا: میں نے امام مالکؒ کو اللہ کی قسم کھا کر یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ''سلاطین میں سے کسی کے پاس بھی جب میں جاتا ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی ہیبت میرے دل سے زائل کر دیتا ہے، تاکہ میں اس سے حق بات کہہ سکوں۔ ۱۹

خلفاء اور حکم رانوں کے بارے میں امام مالکؒ سب سے زیادہ برے ہم نشینوں کی جھوٹی مدح سے ڈرتے تھے، اس لیے کہ یہ تعریف وتوصیف ان کے لیے ان کے

اعمال کو اچھا بنا کر پیش کرتی ہے، چنانچہ وہ برے کو اچھا اور اچھے کو برا سمجھنے لگتے ہیں، پھر ان کے دل کسی خیر خواہ اور رہنما کے وعظ و نصیحت کے لیے نہیں کھلتے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ قاضی عیاض نے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ کے سامنے والیٔ مدینہ منور کے منھ پر اس کی تعریف کی گئی تو امام مالکؒ غصہ ہوگئے اور اس کی طرف مڑ کر کہا: ''خبردار، ان لوگوں کی تعریف سے دھوکہ نہ کھانا، اس لیے کہ جس نے (تمہارے منھ پر) تمہاری تعریف کرتے ہوئے وہ اچھی بات کہی جو تم میں نہیں ہے، یقین کرو کہ وہ تمہارے بارے میں (دوسروں کے سامنے) وہ بری بات بھی کہے گا جو تم میں نہیں ہے، اس لیے اللہ سے ڈرو کہ اپنے آپ میاں مٹھو بنو، یا جو تمہارے منھ پر تمہاری تعریف کرے اس سے خوش ہو، اس لیے کہ ان کے مقابلہ میں تم اپنے نفس کو زیادہ بہتر طریقے سے جانتے ہو۔ مجھے ایک روایت پہنچی ہے کہ نبی ﷺ کے سامنے ایک شخص نے کسی آدمی کی (غیر واقعی) تعریف کی تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم نے اس کی کمر توڑ دی یا گردن مروڑ دی، اگر اس نے یہ تعریف سن لی تو کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ''منھ پر تعریف کرنے والوں کے چہروں پر مٹّی ڈالو''۔[۲۰]

کبھی کبھی امام مالکؒ حکام کے خلاف نصیحت میں سختی سے بھی کام لیتے تھے اور ان کے منھ پر ان کے بارے میں سخت بات کہہ دیتے تھے۔ ایک ایسی ہی بات قاضی عیاض نے نقل کی ہے: مدینہ منورہ کے کسی حکم راں نے امام مالکؒ سے کہا: ''اپنے اصحاب کی طرح آپ خضاب کیوں نہیں لگاتے؟ امام مالکؒ نے جواب دیا: اب خضاب کے علاوہ عدل وانصاف سے متعلق کوئی اور اچھا کام باقی نہیں رہ گیا ہے!''[۲۱]

مسلم حکم رانوں کو نصیحت اور حق کی حمایت کے سلسلے میں امام مالک کی صاف صاف سچی کھری باتوں کے یہ چند نمونے تھے جن کو ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کبھی اعتدال وتوازن اور حکمت وموعظت حسنہ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، نہ فتنہ وفساد کی ہمت افزائی کی۔ خلفاء وحکم رانوں سے تقرب ان کی رہنمائی کے لیے حاصل کیا، لیکن ان کے مظالم ومزاعم باطلہ کی تصدیق کی نہ ان کے تمام اعمال سے رضامندی کا اظہار کیا۔

۴۔ حکّام وسلاطین کے تحفے تحائف قبول کرنا

حکام سے تعلق وتعامل میں اعتدال وتوازن کی ایک علامت خلفاء کے ہدایا قبول کرنا بھی تھی۔ امام مالکؒ کو ان کے معاصر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے برخلاف حکم رانوں کے تحائف قبول کرنے کی حلّت میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ امام ابوحنیفہؒ اموی وعباسی خلفاء کے تحائف قبول نہیں فرماتے تھے، امام مالکؒ خلفاء سے تو تحائف قبول کرلیتے تھے، لیکن ان کے علاوہ دیگر حکام وعہدیداروں سے ہدیہ قبول کرنے میں ضرور احتیاط کرتے تھے، ابن القاسم کے بقول امام مالکؒ فرماتے تھے: ''خلفاء کے ہدایا قبول کرنے میں کوئی شبہ نہیں، یعنی کوئی حرج نہیں، لیکن ان سے کم تر حکام کے تحائف میں کچھ نہ کچھ (شک وشبہ) ہے۔''[۲۲]

بعض لوگ امام مالکؒ کے ہدایا ان میں سے بعض ہدایا قبول کرنے کو بڑی بات سمجھتے تھے، یہاں تک کہ روایت ہے کہ ایک بار خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالکؒ کو تین ہزار دینار بھجوائے، تو ایک زاہد نے ان سے کہا: اے ابوعبد اللہ! آپ نے امیرالمؤمنین سے تین ہزار کی خطیر رقم لے لی۔ امام مالکؒ نے فرمایا: ''اگر وہ امام عادل ہو، شرفاء کو وہ کچھ عطا کرے جس کے وہ مستحق ہوں تو میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، ہاں اگر وہ غیر مستحق کو زیادہ دے تو میں اسے ناپسند کرتا ہوں''۔[۲۳] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ یہ ہدایا تردد کے ساتھ قبول فرماتے تھے، تاکہ اپنی مروّۃ (شرافت) کی حفاظت کریں، ضرورت پوری کریں اور ان ذمہ داریوں کو ادا کریں جو سماجی مرتبہ کی وجہ سے آپ پر عائد ہوتی تھیں، جیسے غریب طلباء کی دیکھ بھال، دیگر محتاجوں کی ضروریات کی تکمیل وغیرہ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نیک مقصد کے باوجود ان کو اس میں کچھ نہ کچھ تردد ضرور رہتا تھا، لہٰذا دیگر لوگوں کو اس خیال سے کہ ہوسکتا ہے ان کی نیت خود آپ کی جیسی خالص پاک نہ ہو، سلطان کے ہدایا قبول کرنے سے منع فرمادیتے تھے۔[۲۴] چنانچہ ان سے کئی لوگوں نے سلطان کے جائزہ (بخشش/عطیہ) کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: نہ لو! اس پر

کسی نے کہا: مگر آپ تو قبول کرتے ہیں! امام مالکؒ نے جواب دیا: کیا تم اپنے اور میرے دونوں کے گناہ اٹھانا چاہتے ہو؟ دوسرے شخص سے اسی طرح کے سوال کے جواب میں فرمایا: کیا تم مجھے میرے گناہوں کی سرزنش کرنے آئے ہو؟''۲۵۔

۵-حکم رانوں کے ظلم و جور پر صبر

حکم رانوں کے ظلم وستم پر صبر اہل سنت و جماعت کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔ اہل سنت کی ہر تألیف میں اس اصول کی تاکید وتحریض ملتی ہے، اس بارے میں احادیث بھی حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۲۶۔ یہ نکتہ بھی ہماری شریعت کے اعتدال وتوازن کی دلیل ہے، اس لیے کہ حکم رانوں کے ظلم وستم پر صبر، نیز ان کے خلاف خروج (بغاوت) سے اجتناب کے ذریعہ ایسے مصالح (فوائد) حاصل ہوتے اور مفاسد رفع ہوتے ہیں جن کا فائدہ ملک اور بندگان خدا کو ملتا ہے۔

اس معتدل ومتوازن طریق کار پر امام مالکؒ کاربند تھے، مگر اس کے باوجود عباسی حکم راں ابوجعفر المنصور کے دور میں ان پر آزمائش کے پہاڑ ٹوٹے، کوڑوں سے ان کی پٹائی کی گئی، یہاں تک کہ ان کے دونوں کندھے اتر گئے، اس کے باوجود وہ اطاعت سے دست کش نہ ہوئے، بلکہ وہ اپنے جلّادوں کے لیے دعائے خیر فرماتے رہے اور ان کی زیادتی کو معاف کر دیا۔

اس آزمائش کے اسباب کے بارے میں مؤرخین کے مختلف اقوال ہیں۔ ابن عبدالبر کے بیان کے مطابق مشہور ترین بات یہ تھی کہ عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور نے امام مالکؒ کو **لیس علی مستکرہ طلاق** (زور زبردستی سے مجبور کئے ہوئے شخص کی طلاق معتبر نہیں) والی حدیث بیان کرنے سے منع کیا تھا، پھر چپکے سے ایک شخص کو اس کے بارے میں دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ امام مالکؒ نے تمام لوگوں کے سامنے وہ حدیث بیان فرمائی۔ اس پر اس نے آپ کو کوڑے لگوائے ۲۷، بیان کیا گیا ہے کہ آپ کو اسّی (۸۰) کوڑے مارے گئے ۲۸۔ الدارودی کا بیان ہے کہ بیعت سے متعلق فتوے کے بارے

میں جب امام مالکؒ کو کوڑے مارے گئے، میں اس وقت ان سے سب لوگوں سے زیادہ قریب تھا، جب بھی ان پر کوڑا پڑتا تھا تو میں ان کو کہتے ہوئے سن تا تھا: **اللّٰھم اغفر لھم، فإنھم لا یعلمون** (اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے اس لیے کہ یہ نہیں جانتے)۲۹

ابوالولید الباجی کا بیان ہے: جب ابوجعفر المنصور نے حج کیا تو والیٔ مدینہ منورہ جعفر بن سلیمان (جس نے امام مالک کو کوڑے لگوائے تھے) سے بدلہ لینے کے لیے امام مالک کو بلوایا کہ اس سے قصاص لے لیں، مگر امام مالک نے فرمایا: ''اللہ کی پناہ! بخدا میرے جسم پر جو کوڑا بھی پڑا، میں نے فوراً رسول اللہ ﷺ سے قرابت کی وجہ سے اس کو اسی وقت معاف کردیا''۔ قاضی عیاض نے نقل کیا ہے کہ ''کوڑوں کی ضرب سے امام مالکؒ بے ہوش ہوگئے، جب انہیں ہوش آیا تو حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا'' میں تم سب کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے کوڑے مارنے والوں کو معاف کردیا''۔۳۱

اس ظلم وستم کے باوجود امام مالکؒ کسی فتنہ میں ملوّث ہوئے نہ کسی کو خروج (بغاوت) پر اکسایا، لیکن کسی کو خوش کرنے کے لیے اور اس کی خواہش کی پیروی میں وہ حدیث شریف بیان کرنے سے بھی باز نہیں رہے، اس لیے کہ یہ کتمان علم کے دائرہ میں آتا ہے، جس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مدینہ منورہ میں محمد بن عبداللہ النفس الزکیۃ کے خروج کے وقت مذکورہ بالا حدیث بیان کرنے کی وجہ سے امام مالکؒ کو کوڑے لگائے گئے تھے، ان کا مقصد لوگوں کو بغاوت پر اکسانا نہیں تھا، انہوں نے تو صرف حدیث بیان کی تھی، لوگوں نے ان سے روایت کرتے ہوئے اس حدیث کو نقل کیا۔ اس موقع پر بعض غرض مند لوگوں نے اس میں سے وہ معنی نکال لیے کہ امام مالک لوگوں کو ابوجعفر المنصور کی بیعت سے دست کش ہونے پر اکسارہے تھے، اس لیے کہ اس کی بیعت جبراً لی گئی تھی، انہوں نے والیٔ مدینہ منورہ کو خبر کردی، اور امام مالکؒ پر امتحان وآزمائش کی آندھی گزر گئی۳۲۔ ابن عبدالبر کی الانتقاء میں بھی یہی بات مذکور ہے۳۳۔

حکام وقت کے ساتھ ربط وتعلق کے معاملے میں امام دار الھجرۃ مالکؒ کا یہ

معتدل ومتوازن منہج تھا، خواہ حکام کوڑے مار مار کے ان کی پیٹھ ادھیڑ دیں اور ان کا مال ودولت ضبط کرلیں۔ انہوں نے یہ سب مصیبت امت کی مصلحت (مفاد) اور خروج (بغاوت) کے مفاسد سے احتراز کے لیے مول لی۔ مصلحین کو اسی مسلک کی پیروی کرنی چاہئیے اور مخلصین کو یہی نمونہ اپنانا چاہئیے، اس لیے کہ شرعی و سیاسی اصلاح کا راستہ فوجی انقلابات کے ذریعہ حکام کے خلاف مسلح بغاوت نہیں ہے، تشدد کی یہ کارروائیاں موجودہ زمانہ کی بدعتیں (ایجاد بندہ) ہیں، مگر وہ اسلامی نصوص ومقاصد اور اعتدال ومیانہ روی کے خلاف ہیں۔ اسلام تو اولاً دل کی دنیا بدلنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر بنیاد مضبوط نہیں ہوگی تو اس پر مستحکم اور بلند وبالا عمارت تعمیر نہیں ہوسکتی۔ اللہ سبحانہ وتعالی کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت بدلنے کے لیے پرعزم نہ ہو۔ ان احمقانہ سیاسی انقلابات اور فوجی بغاوتوں کو ہم بہت جھیل چکے، اور ان کے مفاسد بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو چکے۔ کاش کہ اب ہم امام مالکؒ کے معتدل ومتوازن راستہ سے رہنمائی حاصل کریں۔

حواشی ومراجع

۱۔ العقیدۃ الطحاویۃ، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ص ۶۸

۲۔ محمد ابوزھرۃ، مالک: حیاتہ وعصرہ وآراءہ وفقہہ، دارالفکر العربی، القاہرۃ، ص ۴۸-۵۰

۳۔ الشاطبی، الاعتصام، تحقیق حسن آل سلمان، مکتبۃ التوحید، المنامۃ، البحرین، ۳/۴۶

۴۔ حوالہ سابق

۵۔ محمد ابوزھرۃ، مالک.....ص ۵۲-۵۳

۶۔ حوالہ سابق

۷۔ علال الفاسی، نضالیۃ الامام مالک ومذہبہ، مطبعۃ الرسالۃ، الرباط، المغرب، ص ۱۱

۸۔ المدونۃ الکبری، تحقیق محمد محمد تامر، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، القاہرۃ، ۱/۵۸۹

۹۔ حوالہ سابق ۱/۵۹۰ ۱۰۔ حوالہ سابق، ۱/۵۹۰

۱۱ ابن رشد، البیان والتحصیل، تحقیق محمد حجی، دار الغرب الاسلامی، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، ۱/۴۴۳

۱۲ حوالہ سابق، ۱۸/۴۰۰

۱۳ ابن رجب، جامع العلوم والحکم فی شرح خمسین حدیثاً من جوامع الکلام، تحقیق محمد الأحمدی ابوالنور، دار السلام، القاہرۃ، ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۴ء، ۱/۳۵۶

۱۴ الشوکانی، رفع الأساطین فی حکم الاتصال بالسلاطین، تحقیق حسن محمد الظاہر، دار ابن حزم، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء، ص ۴۷-۷۵

۱۵ القاضی عیاض، ترتیب المدارک وتقریب المسالک لمعرفۃ أعلام مذہب مالک، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء، ۱/ ۱۱۱ اور ابن فرحون، الدیباج المذہب فی معرفۃ أعیان علماء المذہب، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء، ص ۷۵

۱۶ القاضی عیاض، ترتیب المدارک.....۱/ ۱۱۱،

۱۷ ۱۸ ۱۹ حوالہ سابق ۲۰ حوالہ سابق ۱/۱۱۳

۲۱ حوالہ سابق ۲۲ حوالہ سابق ۱/ ۱۱۷

۲۳ حوالہ سابق ۲۴ محمد ابوزہرہ، مالک.....ص ۳۹

۲۵ القاضی عیاض، ترتیب المدارک.....۱/ ۱۱۷-۱۱۸

۲۶ الشوکانی، رفع الأساطین.....، ص ۸۱-۸۸

۲۷ ابن عبد البر، الإنتقاء فی فضائل الأئمۃ الثلاثۃ الفقہاء، تحقیق عبد الفتاح ابو غدۃ، دار البشائر الإسلامیۃ، بیروت، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء، ص ۸۷

۲۸ القاضی عیاض، ترتیب المدارک.....، ۱/ ۱۲۵

۲۹ حوالہ سابق ۳۰ حوالہ سابق ۱/۱۲

۳۱ حوالہ سابق ۳۲ محمد ابوزہرۃ، مالک.....ص ۵۹

۳۳ ابن عبد البر، الإنتقاء.....، ص ۸۷

(مأخذ: سہ ماہی آفاق الثقافۃ والتراث، دبئی، متحدہ عرب امارات، ۱۴/۵۵، اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۹-۲۷)

تعارف وتبصرہ

ہندوستانی مفسرین اوران کی عربی تفسیریں محمد سالم قدوائی

ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۲۰۰۶ء، صفحات ۲۹۴، قیمت -/۲۰۰ روپے

ہندوستان میں عربی زبان میں علم تفسیر کے میدان میں کیا کچھ کام ہوا ہے؟ کتنی مکمل یا نامکمل تفسیریں، کتب تفسیر پر حواشی وتعلیقات اور مختلف علوم قرآنی پر تصنیفات و تالیفات معرضِ وجود میں آئی ہے؟ زیر نظر کتاب اس موضوع پر ایک بھرپور مطالعہ ہے۔ اصلاً یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر فاضل مصنف کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔ عرصہ سے یہ کتاب نایاب تھی۔ اسلامک بک فاؤنڈیشن کی دل چسپی سے اب اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں ان تفسیروں کا ذکر ہے جو مکمل ہوگئی تھیں، خواہ وہ مکمل ملتی ہوں یا نہ ملتی ہوں، باب دوم میں اجزائے قرآن کی تفسیروں کا تعارف ہے یعنی مختلف سورتوں کی یا محض آیتوں کی۔ باب سوم میں قدما کی تفسیروں کے حواشی اور شرحوں کا ذکر ہے۔ باب چہارم متعلقات قرآن پر لکھی گئی کتابوں کے تعارف پر مشتمل ہے۔ باب پنجم میں ان مصنفین کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں جن کا تذکرہ کتب سوانح میں بحیثیت مفسر ملتا ہے، لیکن ان کی کتابیں مفقود ہیں۔ فاضل مصنف نے ہر مفسر کے حالاتِ زندگی پر مختصر روشنی ڈالنے کے ساتھ مشتملاتِ کتاب کا کسی قدر تفصیل سے تعارف کرایا ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ ایک تہائی صدی گزر جانے کے باوجود فاضل مصنف کو اس میں اضافہ کرنے کے لیے کچھ نہیں ملا۔ لکھتے ہیں: ''میں برابر اس فکر میں رہا کہ کچھ مزید معلومات اگر حاصل ہوسکیں تو انہیں نئے ایڈیشن میں شامل کردوں، مگر کوئی قابلِ ذکر چیز ہاتھ نہ لگی'' (ص ۵) اس عرصہ میں قرآنیات پر متعدد فہرستیں (BIBLIOGRAPHIES) اور تاریخ تفسیر ومفسرین پر متعدد

کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان کی روشنی میں متعلقہ موضوع پر خاطر خواہ اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ فاضل مصنف نے مولانا فراہیؒ کے اجزائے تفسیر سے صرف تین (تفسیر سورۂ مرسلات، تفسیر سورۂ عصر اور تفسیر سورۂ کافرون) کا تذکرہ کیا ہے۔ حالاں کہ ان کے علاوہ فاتحہ، ذاریات، تحریم، قیامۃ، عبس، شمس، تین، فیل، کوثر اور لہب نامی سورتوں کے تفسیری اجزا کے علاوہ سورۂ بقرہ کی ناتمام تفسیر بھی شائع ہوچکی ہے۔ مولانا کی کتاب مفردات القرآن کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں ۷۷ الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نیا ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں دائرۂ حمیدیہ سے ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوا ہے جس میں فاضل محقق نے مولانا کی دیگر تحریروں سے ۴۲ کلمات کا اضافہ کیا ہے۔ مولانا کا نام حمیدالدین فراہی لکھا گیا ہے، حالاں کہ وہ عربی تحریروں میں اپنا نام عبدالحمید لکھا کرتے تھے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

شاہ ولی اللہ کا رسالۂ سیرت — پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

(سرور المحزون فی ترجمة نور العیون)

ناشر: حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، مظفرنگر یوپی، نومبر ۲۰۰۶ء، ص: ۲۴۰، قیمت -/۱۰۰ روپے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادارۂ علوم اسلامیہ کے تحت شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل یوں تو دو دہائیوں سے زائد عرصہ سے قائم تھا، لیکن اس کی سرگرمیاں معدوم تھیں۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اپنی چیرمین شپ کے زمانے میں اس کا احیاء کیا۔ قرآن، حدیث، تصوف اور تاریخ و سیرت میں شاہ ولی اللہ کی خدمات اور ان کی معرکہ آرا تصنیف 'حجۃ اللہ البالغہ' کے تجزیاتی مطالعہ پر متعدد سمینار کرائے، شاہ صاحب کی تصانیف کی تدوین و اشاعت، ترجمہ اور تحقیق کے منصوبے تیار کیے اور اس عرصہ میں خود بھی متعدد کتب تصنیف کیں۔ ان میں شاہ ولی اللہ کا فلسفۂ سیرت، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی- شخصیت و حکمت کا ایک تعارف (اردو، عربی، انگریزی) اور حجۃ اللہ البالغہ- ایک ایک تجزیاتی مطالعہ ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی سے اور شاہ ولی اللہ کی خدماتِ حدیث

شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت سے شائع ہوچکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی مذکورہ اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

سیرت نگاروں میں امام ابن سید الناسؒ (م۷۳۴ھ/۱۳۳۳ء) عیون الأثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر کے مؤلف کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ سیرت پر ان کا ایک مختصر رسالہ بھی ہے جس کا نام نورالعیون فی تلخیص سیرۃ الأمین المامون ہے۔ شاہ ولی اللہ (م۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے اس کا فارسی ترجمہ سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون کے نام سے کیا تھا۔ پروفیسر صدیقی نے اس کا اردو ترجمہ ایضاح المکنون کے نام سے کردیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں عربی متن کے ساتھ فارسی اور اردو ترجمے بھی شامل ہیں۔ فاضل مترجم نے 'تقدیم' میں سیرت نگاری کے رجحانات سے بحث کرتے ہوئے مختصراتِ سیرت کا تعارف کرایا ہے اور ابن سید الناس کے اصل کتابچہ اور شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

سیرت نگاری پروفیسر صدیقی کی علمی خدمات کا خاص میدان ہے۔ اس موضوع پر ان کی ایک درجن سے زائد تصانیف اور بہت سے مقالات (جن میں سے بڑی تعداد 'تحقیقاتِ اسلامی' میں شائع ہوئی ہے) اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ امید ہے، زیرِ نظر کتاب کو بھی قبولِ عام حاصل ہوگا اور سیرتِ نبوی اور تصانیفِ ولی اللہی کے مطالعات میں اس کی اہمیت کو محسوس کیا جائے گا۔ (م-ر-ن)

اصحابِ کہف کے غار کا انکشاف

پروفیسر محمد نعمان خان

تقسیم کار۔ اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، صفحات ۲۴۵، قیمت/۱۵۰ روپئے

قرآن کریم نے ایک مقام پر اصحاب الکہف والرقیم کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق کچھ نوجوانوں نے اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کی خاطر ایک غار میں پناہ لی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی خاص رحمت سے نوازا اور ان کو اسی غار میں سُلا دیا۔ طویل عرصے کے بعد وہ جاگے اور لوگوں کو ان کا علم ہوا تو انہوں نے اس غار کے قریب ایک معبد

بناڈالا۔ مستشرقین نے قرآنی قصوں کو اور خاص طور پر اس واقعہ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ا نہوں نے لکھا ہے کہ قرآن نے بغیر کسی تحقیق کے اس واقعہ کو نقل کرلیا ہے۔ اس کے بیان کردہ اوصاف کسی متعین غار پر منطبق نہیں ہوتے۔

اصحاف کہف نے جس غار میں پناہ لی تھی وہ کہاں اور کس ملک میں واقع ہے؟ کس بادشاہ کے ظلم سے بچنے کے لیے انہوں نے غار میں پناہ لی تھی؟ پھر جب طویل مدت کے بعد وہ بیدار ہوئے تو کس بادشاہ کا عہد تھا؟ تفسیری روایات میں اس کی کوئی واضح تفصیل نہیں ملتی۔ آثار صحابہ میں کچھ اشارات ہیں جو باہم مختلف ہیں۔ مفسرین کرام نے عموماً تین مقامات کا ذکر کیا ہے۔ قرآن میں مذکور اصحاب کہف کا غار (۱) دمشق کے قریب کہیں واقع ہے (۲) ایشیائے کوچک کے ساحلی شہر افسوس/افیسس میں ہے جس کا کھنڈر آج موجودہ ترکی میں پایا جاتا ہے۔ (۳) بلقاء/ ایلیہ کے قریب ہے جو خلیج فارس کے ساحل پر عمان کے نزدیک کوئی مقام ہے۔

۱۹۶۳ء میں محمد تیسیر ظبیان سکریٹری رابطۂ علوم اسلامیہ اردن کی کوششوں سے محکمۂ آثارِ قدیمہ اردن کی زیرنگرانی عمان کے جنوب میں واقع الرجیب نامی بستی سے متصل ایک غار کی کھدائی کی گئی جس کے بارے میں مقامی باشندوں کا خیال تھا کہ یہ اصحاف الکہف والرقیم کا غار ہے۔ کئی سالوں میں یہ کام مکمل ہوا۔ بہت سے شواہد ملے اور اسے اصحاب کہف کے غار کا انکشاف سمجھا گیا۔ پیش نظر کتاب میں اسی انکشاف کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف پروفیسر محمد نعمان خان شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر ہیں۔ اس سے پہلے اردنی سفارت خانہ دہلی میں مقامی سکریٹری رہ چکے ہیں۔ اردن کی اکیڈمی ''المجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیۃ'' میں بھی کام کرچکے ہیں۔

مصنف نے پہلے قرآن مجید کی روشنی میں اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا ہے پھر دیگر اسلامی اور عیسائی مآخذ کی مدد سے اس قصہ کی بعض تفصیلات ذکر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کس ظالم بادشاہ کے ظلم سے مجبور ہوکر اور اپنے ایمان کو بچانے کی خاطر اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی تھی؟ اور جب وہ بیدار ہوئے تو کس بادشاہ کی

حکومت تھی اور وہ کون سا زمانہ تھا؟ اسی طرح انہوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ جس غار میں اصحاب کہف نے پناہ لی تھی اس کے محل وقوع سے متعلق اسلامی روایات کیا کہتی ہیں اور عیسائی روایات میں کیا کچھ ہے؟ مصنف نے تاریخی واثری ثبوت بھی جمع کیے ہیں۔ حکومت اردن نے محمد تیسیر ظبیان کی تحریک پر کھدائی کی اجازت دی اور رفیق وفاالدجانی کی نگرانی میں اردن کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے کھدائی کا کام کیا۔ ان دونوں حضرات کی مرتب کردہ کتابوں سے فاضل مصنف نے اثری تحقیقات کی تفصیلات درج کی ہیں۔

اصحاب کہف کے غار کے محل وقوع کے سلسلے میں علماء اور مفسرین کے درمیان شروع سے اختلاف رہا ہے۔ لیکن متأخرین کے یہاں یہ قول زور پکڑ گیا کہ یہ غار رقیم کے اثری شہر افسوس میں ہے۔ یہ بات اتنی عام ہوگئی کہ اکثر متأخر محققین کا میلان اسی طرف رہا۔ کتاب میں اس قول کو رد کیا گیا ہے اور تاریخی حقائق کی روشنی میں نقد کرکے دکھایا گیا ہے کہ افسوس کا غار وہ غار ہرگز نہیں ہوسکتا جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ مستند ذی علم شخصیات کی تحقیقی کاوشوں کے حوالوں سے کتاب بھرپور ہے۔ تفاسیر پر مصنف کی اچھی نظر ہے۔ انہوں نے اہم تفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف آراء کے درمیان علمی وتحقیقی اسلوب میں موازنہ کیا ہے۔ احتیاط کے ساتھ تاریخی اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ صحابہ وتابعین کے سفر غزوات وغیرہ کی تفصیل نقل کرکے ان کے اقوال کو بطور تائید پیش کیا ہے۔ بعض صحابہ کے اقوال کی روشنی میں صاحب کتاب کا خیال ہے کہ ابتدائی عہد میں اصحاب کہف کے غار کا محل وقوع معلوم تھا۔

یہ کتاب قرآنیات سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ، اور تاریخی ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک اہم دستاویزی کام ہے۔ صاحب کتاب کے الفاظ میں ''اصحاب کہف کے غار کی دریافت بیسوی صدی کا ایک عظیم کارنامہ اور قرآن کریم میں بیان کردہ واقعہ کی تصدیق ہے'' (ص ۷)

فاضل مصنف نے دستیاب مراجع سے استفادہ کرکے یہ کتاب ترتیب دی

ہے۔ انکشاف کی تائید میں جابجا حوالے بھی دیے ہیں۔لیکن نامعلوم کیوں انہوں نے حوالہ دینے کا عصری طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ چنانچہ بہت سے مقامات پر مآخذ کے صفحات نمبر ذکر نہیں کیے ہیں۔مصنف کے پیش نظر تمام اہم اردو تفاسیر رہی ہیں جن کے اقتباسات انہوں نے بطور ضمیمہ نقل کر دیے ہیں۔ اگر جدید عربی تفاسیر بھی ان کے پیش نظر رہتیں تو بہتر تھا۔محکمۂ آثار قدیمہ اردن کی دستاویزات کا عکس بھی کتاب کے استنادی پہلو کو تقویت دیتا۔کتاب کے صفحات ۶۵ تا ۸۰ بے ترتیب ہوگئے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ زیر نظر کتاب عمدہ اور تحقیقی ہے۔ امید ہے کہ علمی حلقوں میں اسے پذیرائی حاصل ہوگی۔

(سراج احمد برکت اللہ فلاحی)

خطباتِ جمعہ — پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

ناشر:ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی-۶۲، صفحات:۳۵۱، سنۂ اشاعت:۲۰۰۶ء،

اسلام کے تربیتی نظام میں جمعہ کے خطبات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔رسول کریم ﷺ ہر جمعہ کو مسجد کے منبر سے جو خطبات دیتے تھے ان میں عام ہدایات کے ساتھ وقت کے موضوعات اور سوالات پر بھی گفتگو ہوتی تھی اور سماج کو درپیش مسائل ومشکلات پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ پوری اسلامی تاریخ میں جاری رہا اور جمعہ کے خطبات سے سماج کی اصلاح، لوگوں کی دینی واخلاقی تربیت، دینی تعلیمات کی اشاعت اور عمومی ہدایت ورہ نمائی کا عظیم الشان کام انجام پاتا رہا۔ آج بھی جن ممالک کی زبان عربی ہے وہاں خطبات جمعہ کے ذریعہ اس مقصد کو بروئے کار لایا جارہا ہے۔

غیر عربی سماج میں عربی خطبات سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جو خطبات جمعہ کی روح ہے۔ اس کمی کی تلافی کے لیے کچھ جگہوں پر خطبۂ جمعہ سے پہلے علاقائی زبان میں تقریر کا رواج ہے۔لیکن اس سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جمعہ کے دو خطبوں میں سے پہلا خطبہ اردو یا علاقائی زبان میں دیا جائے اور دوسرا عربی میں ہو۔اس مناسبت سے آل

انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، جو ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا علم بردار ہے، اس نے ایسے خطبات کے مجموعے تیار کرانے کی ضرورت محسوس کی جنھیں مساجد کے ائمہ جمعہ کے خطبات میں پڑھ کر سنا سکیں۔ لیکن یہ کام اب تک مطلوبہ طریقہ پر انجام نہ پا سکا تھا۔

مولانا پروفیسر سعود عالم قاسمی ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے زیرِ نظر کتاب کی صورت میں اس ضرورت کو بحسن وخوبی پورا کیا ہے۔ مولانا موصوف جو دینی بصیرت کے ساتھ عصری آگہی بھی رکھتے ہیں اور خطبات جمعہ کے مؤثر کردار کا بھرپور احساس بھی رکھتے ہیں، انھوں نے اپنی ان گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے خطبات جمعہ کے اس مجموعہ کو جامع، دلنشیں، مؤثر، فکر انگیز اور با مقصد بنانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اپنے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ: ''ان خطبات میں ایمان وعقائد، اعمال واذکار، اخلاق وعادات، سماجی ومعاشی اصلاح اور بعض مروّجہ رسوم کی تطہیر کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن وسنت، اسوۂ صحابہ اور تاریخ اسلامی کے معتبر واقعات سے استفادہ کیا جائے۔ زبان سادہ اور ابہام سے پاک ہو۔ ہر خطبہ اوسطاً چھ صفحات پر مشتمل ہو جو دس منٹ کے اندر پڑھا جا سکے''۔ یہ انتخاب اور یہ طرز دونوں مستحسن ہیں۔ پھر مؤلف نے ان خطبات کی ترتیب بھی ہجری سال کے مہینوں کے لحاظ سے رکھی ہے۔ اس طرح ۳۵۰ صفحات کی اس کتاب میں ۵۳ خطبات تحریر کر دیے گئے ہیں، جو پورے سال کے لیے کافی ہو جاتے ہیں۔ خطبات کے موضوعات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلافی باتوں سے گریز کرتے ہوئے انتہائی سہل زبان میں قرآن و حدیث اور تاریخ وسیرت کی روشنی میں خطبات تیار کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں خطبۂ جمعہ کی اہمیت اور تقاضوں پر ایک تحریر شامل ہے اور خطیب کی ذمہ داریوں سے متعلق بڑے حکیمانہ مشورے دیے گئے ہیں، کتاب پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور دارالعلوم دیوبند وقف کے مہتمم مولانا محمد سالم قاسمی کی تقریظات ثبت ہیں۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے اس گراں قدر کام میں اپنا فیاضانہ تعاون پیش کیا ہے، اس پر وہ بے انتہا شکریہ کی مستحق ہے۔ ہم سوسائٹی سے توقع رکھتے ہیں کہ ان خطبات

کا ملک کی علاقائی زبانوں میں ترجمہ کراکے ان کی اشاعت میں بھی دل چسپی لے گی، تاکہ اس کی افادیت کا دائرہ وسیع ہو۔ یہ کام مسلم پرسنل لا بورڈ بھی اپنی سطح پر انجام دے سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کو پورے ملک میں عام کیا جائے۔ ائمہ جمعہ کے لیے کتاب بلا قیمت ناشر کے پتہ پر دستیاب ہے۔

(محمد فہیم اختر ندوی)

مجلّہ 'الدین' (۰۶-۲۰۰۵ء) ایڈیٹر: محمد شمیم اختر قاسمی

ناشر: تھیالوجیکل سوسائٹی، شعبۂ سنّی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، صفحات: ۲۸۸

مجلّہ 'الدین' تھیالوجیکل سوسائٹی شعبۂ سنّی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ترجمان سالنامہ ہے۔ اس کے زیرِ نظر شمارہ میں شعبہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کے علاوہ یونیورسٹی کے دیگر شعبوں اور باہر کے اہل علم کے مضامین بھی شامل ہیں۔ پیغامات، اداریہ اور روداد مذاکرہ کے علاوہ یہ مجلّہ ۲۳ مقالات پر مشتمل ہے۔ موضوعات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتبین نے موجودہ حالات کے تناظر میں ہی زیادہ تر مضامین اکٹھا کرکے اہلِ علم کو دعوت فکر دی ہے۔ چند عناوین یہ ہیں: اسلام، مستشرقین اور مدارسِ دینیہ، اسلام اور امنِ عالم، اکیسویں صدی کے حوالے سے ناظرہ عربی زبان اور مطالعۂ قرآن کے مسائل، شرم وحیا اسلام کی نظر میں، مشرقی طریقۂ تعلیم: ایک جائزہ، مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر اور قرآن، انسانی کلوننگ اور اسلام، دار القضاء کی شرعی حیثیت ہندوستانی تناظر میں، اسلام میں تعلیمِ نسواں اور عصر حاضر کے تقاضے، نکاح میں لڑکی کی رضا مندی اور ہمارا سماج۔ آخر میں ایک سمینار کی رپورٹ ہے جو شعبہ میں 'برصغیر کی جامعات میں دینی تعلیم اور عصری تقاضے' کے عنوان سے منعقد ہوا تھا۔

ایک جگہ (ص ۲۷۳) مولانا سلمان الحسینی ندوی کو ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ لکھا گیا ہے جب کہ موصوف وہاں کے مؤقر استاذ ہیں اور ناظم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ہیں۔اسی طرح سمینار میں پیش کردہ ایک مقالے میں ہندوستان کے چھ مدارس میں نصاب تعلیم کا جائزہ لیا گیا تھا، اس کی رپورٹ میں پانچ مدارس کا نام درج کیا گیا ہے۔ (ص ۲۸۰) جب کہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کا نام درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

زیرِ نظر مجلّہ مضامین کے تنوع کے اعتبار سے ایک مفید اور اہم علمی پیش کش ہے۔اس پر فاضل مدیر اور دیگر معاونین مبارک باد کے مستحق ہیں۔امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی پزیرائی ہوگی۔

(مجاہد شبیر احمد فلاحی)

کنکر بولتے ہیں تابش مہدی

ناشر: فریوائی اکادمی، سی ۲/۷، شاہین باغ، نئی دہلی-۲۵، ۲۰۰۵ء، صفحات: ۱۴۴، قیمت: -/۱۰۰ روپے۔

تابش مہدی بیک وقت ناقد و محقق بھی ہیں اور شاعر بھی۔ انھوں نے جہاں ایک طرف اپنی تنقیدی و تحقیقی کاوشوں کے ذریعہ اہل علم و ادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے وہیں شاعری کے ذریعہ بھی اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ان کی اب تک کل ۱۰ر کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جو شاعرانہ مہارت کے علاوہ ان کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔اس مجموعے سے قبل ان کی نعتوں کا مجموعہ ''سلسبیل'' منظر عام پر آ کر فکر وفن کی انفرادیت کے نقوش قائم چکا ہے۔زیر تبصرہ کتاب ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

تابش مہدی اپنی فکر کے اعتبار سے اسلام پسند ہیں۔ چنانچہ ان کی یہ اسلام پسندی ان کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔الحاد و لادینی کے اس دور میں ''زندہ اسلام'' سے ان کی وابستگی ان کے فکر کو غذا اور توانائی فراہم کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں نہ صرف فکر وعمل کا کوئی تضاد نظر نہیں آتا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کی شاعری مقصدیت کی حامل بن کر سامنے آتی ہے۔

تابش کی شاعری روایت کی پاس داری، اخلاقی قدروں کے احترام اور حکمت و موعظت کی شاعری ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق پر لطیف طرز کا اظہار اور عصری شعور ان

کے یہاں بہت نمایاں ہیں۔تابش مشکلات زندگی اور ناہمواریوں سے گھبراتے نہیں، بلکہ ان کا عقیدہ انہیں حوصلہ فراہم کرتا ہے اوران کی شاعری لوگوں کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ قلندری ان کے مزاج میں رچی بسی ہے، جسے دور سے پہچانا جاسکتا ہے۔ان کی شاعری میں خاصی دل کشی ہے، ہرغزل کا کوئی نہ کوئی شعر دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اظہار کی سطح پر انھوں نے جدید لب ولہجہ کے ساتھ کلاسیکی انداز کو بھی خوب صورتی کے ساتھ برتا ہے۔وہ اپنی بات بہت سادگی اور آسانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ندرت وتازہ کاری کے خوب صورت نمونے ملتے ہیں۔ان خوبیوں کے ساتھ ان کی شاعری ''شاعری کے جنگل'' میں ایک توانا آواز کی شکل میں نمایاں نظر آتی ہے اور بقول مخمور سعیدی: ''تابش کی شاعری دیر تک زندہ رہنے والی شاعری ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی تابندگی اور بڑھے گی''۔

ذیل کے چند اشعار میں ان کی شاعری کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے:

تمام عمر اندھیروں سے میری جنگ رہی
بجھا چراغ تو دل کو جلا لیا میں نے

ترے کلام سے میں کسب نور کرتا ہوں
اسی سبب سے مرا بھی کلام روشن ہے

کس قدر روشنی ہے مرے شہر میں
زندگی جل رہی ہے مرے شہر میں

ہر آدمی اوڑھے ہے تقدس کا لبادہ
لگتا ہے یہاں کوئی گنہ گار نہیں ہے

کون ہوں، کیا ہوں، میرا مقصد ہے کیا
کس نے اس پہلو پہ سوچا دیر تک؟

نہ مال و زر نہ عزو شان رکھیے
فقط اللہ پر ایمان رکھیے

آپ بھی ایوان میں دیجیے مسلسل حاضری
مرتبے میں آپ بھی والا گہر ہوجائیے

(محمد شہاب الدین)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی

☆ صدرِ ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی ایک نئی تصنیف بعنوان 'کم زور اور مظلوم- اسلام کے سایے میں' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں قرآن و حدیث اور کتبِ سیرت وفقہ کی روشنی میں مدلل طور پر بتایا گیا ہے کہ اسلام نے کم زوروں کے مسائل کو خصوصی اہمیت دی ہے اور ان کے حل کے لیے ہمہ جہت اقدامات کیے ہیں۔ صفحات: ۱۱۶، قیمت اعلیٰ ایڈیشن،-/۵۰ روپے۔ عام ایڈیشن،-/۳۵ روپے

مولانا کے ایک کتابچہ 'خدا کی غلامی- انسان کی معراج' کے کئی ایڈیشن مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوئے ہیں۔ اب اس کا ہندی ترجمہ بھی طبع ہوچکا ہے۔

جماعتِ اسلامی ہند کا کل ہند امیر منتخب ہونے کے بعد مختلف رسائل و جرائد میں مولانا عمری کے انٹرویوز شائع ہوئے۔ ان میں ملکی، ملّی اور عالمی مسائل پر جماعت کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے اور اس کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان انٹرویوز کا مجموعہ 'موجودہ حالات میں جماعتِ اسلامی ہند کا لائحۂ عمل' کے عنوان سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوگیا ہے۔ صفحات ۳۲، قیمت اعلیٰ ایڈیشن-/۱۰ روپے، عام ایڈیشن-/۴ روپے

☆ ادارہ کی مجلسِ منتظمہ کا سالانہ اجلاس ۳۰/ جولائی ۲۰۰۴ء کو دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں ادارہ کی سوسائٹی کے بنیادی رکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ (علی گڑھ) اپنی علالت کی بنا پر شریک نہیں ہوسکے تھے اور بنیادی رکنیت سے اپنا استعفیٰ بھیج دیا تھا۔ اراکینِ مجلس نے ان کی صحت کے پیش نظر ان کا استعفا منظور کرلیا اور ان کی جگہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی کو ادارہ کا بنیادی رکن منتخب کرلیا۔ اسی اجلاس میں سکریٹری ادارہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی نے اپنی علالت اور ضعف کی بنا پر خواہش ظاہر کی کہ انھیں ادارہ کی سکریٹری شپ کی ذمہ داری سے سبک دوش کردیا جائے۔ اراکینِ مجلس نے اس سے اتفاق کیا اور ان کی جگہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی کو سکریٹری منتخب کرلیا۔ موصوف

نومبر ۲۰۰۶ء سے معاون سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ البتہ اراکینِ مجلس نے ڈاکٹر فریدی سے باصرار خواہش کی کہ ادارہ کے علمی امور میں ان کا تعاون اور رہ نمائی جاری رہنی چاہیے۔ اس کے لیے انھیں ادارہ کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔

☆ ادارہ کے رکن ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی کتاب 'کفر اور کافر-قرآن کی روشنی میں' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔ اس کتاب میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو غیر مسلموں کے درمیان ان اصطلاحات کے سلسلے میں پائی جاتی ہیں اور وضاحت کی گئی ہے کہ غیر مسلموں کے سلسلے میں اسلام کا صحیح رویّہ کیا ہے؟ صفحات: ۶۰، قیمت -/۲۰ روپے۔

ڈاکٹر ندوی کی ایک اور کتاب ''اسلام اور سائنس اردو رسائل میں'' خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں ہندو پاک کے اردو رسائل میں اسلام اور سائنس کے موضوع پر شائع ہونے والے دو سو مضامین کا وضاحتی اشاریہ تیار کیا گیا ہے۔ صفحات: ۱۴۲ قیمت -/۱۳۰

☆ صفا شریعت کالج، ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر (یوپی) میں قائم قرآن اکیڈمی کے زیر اہتمام ''معاشی مسائل ومشکلات اور ان کا اسلامی حل'' کے عنوان سے مورخہ ۲۱-۲۲/ جولائی ۲۰۰۷ء کو دو روزہ سمینار منعقد ہوا، جس میں ملک و بیرون ملک سے مقتدر دینی وعلمی شخصیات شریک ہوئیں۔ رکنِ ادارہ مولانا سلطان احمد اصلاحی نے اس میں شرکت کی اور 'زکوٰۃ اور اس کے مصارف کا مطالعہ معاشی نقطۂ نظر سے' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

☆ ادارہ کی سرگرمیوں کا ایک جزء اہم علمی و دینی موضوعات پر ماہرین کے توسیعی خطبات کا انعقاد ہے۔ اس کے تحت مورخہ ۲۴/ جون ۲۰۰۷ء کو مشہور ماہرِ معاشیات پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی نے 'مقاصدِ شریعت کی روشنی میں معاصر اسلامی مالیات کا جائزہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس پروگرام میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور دیگر اہلِ علم نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

☆ علمی حلقوں، بالخصوص تحقیقات اسلامی سے دل چسپی رکھنے والوں میں یہ خبر مسرت

کے ساتھ سنی جائے گی کہ ادارۂ تحقیق کے ایک بہی خواہ جناب نیاز احمد شریف صاحب (بنگلور) کے تعاون سے ان شاء اللہ بہت جلد تحقیقاتِ اسلامی کے گزشتہ تمام شمارے انٹرنیٹ پر فراہم ہوں گے۔ موصوف نے بڑا حصہ اسکین کرلیا ہے اور یہ کام آخری مرحلے میں ہے۔ اس علمی خدمت پر موصوف ادارۂ تحقیق اور شائقینِ علم دونوں کی جانب سے ازحد شکریے کے مستحق ہیں۔

☆ ادارہ کا ایک اہم شعبہ تصنیفی تربیت کا ہے۔ اس کے تحت دینی وعصری جامعات کے فارغین کو دینی موضوعات پر علمی وتحقیقی انداز میں تحریر وتصنیف کی مشق بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اس وقت شعبے سے تین نوجوان فضلاء وابستہ ہیں۔ انھیں قیام کی سہولت فراہم کرنے کے علاوہ دو ہزار روپے ماہانہ اسکالرشپ بھی دی جارہی ہے۔ ادارہ کے ذمہ داران نے اسکالرس کی تعداد بڑھانے اور اسکالرشپ کی رقم میں اضافہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ کام اصحابِ خیر کے سرگرم تعاون ہی سے ممکن ہے۔

☆ ادارہ تحریک اسلامی کی ذمہ دار شخصیات کی سرپرستی میں، خاموشی کے ساتھ اہم علمی و دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے تمام تر مصارف بعض رفاہی اداروں اور اصحابِ خیر کے مالی تعاون سے پورے ہوتے ہیں۔ ادارہ کے معمول کے مصارف تقریباً آٹھ لاکھ روپے سالانہ ہیں۔ اس کے علاوہ تعمیرات سے متعلق دیگر کئی منصوبے ہیں جو خطیر رقم کے متقاضی ہیں۔ اصحابِ خیر سے گزارش ہے کہ رمضان المبارک کے موقع پر حتّی الوسع خود بھی اس کا مالی تعاون کریں اور اپنے حلقۂ احباب میں دوسرے اصحابِ خیر کو بھی اس کی جانب متوجہ کریں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

IDARA-E-TAHQEEQ-O-TASNEEF-E-ISLAMI

A/c No.7348,Bombay Mercantile Co-operative Bank Ltd, Dodhpur, Aligarh - 2022001

(ادارہ)

کارکنانِ ادارۂ تحقیق کی دو اہم تصانیف

آزادیٔ فکر ونظر اور اسلام

مولانا سلطان احمد اصلاحی

آزادیٔ فکر ونظر دورِ حاضر کی ایک مسلّمہ قدر ہے جس کے حوالہ سے آج کا انسان اسلام سمیت دنیا کے تمام افکار و مذاہب پر تنقید کو اپنا حق سمجھتا ہے۔اسی طرح بین مذہبی گفتگو کا بھی اسے لازمی حصّہ سمجھا جاتا ہے کہ دیگر مذاہب ہی کی طرح اسلام پر بھی آدمی کو بھرپور تنقید کا حق ملے۔ اسلام دیگر مذاہب وافکار پر کھل کر تنقید کرنے اور ان کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی کرنے کو اپنا حق سمجھتا ہے،لیکن دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اسلام پر اظہارِ خیال کرنے میں کچھ حدود کا پابند بناتا ہے۔

اس کتاب میں زیرِ بحث موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل اور مدلّل بحث کی گئی ہے جس سے ایک اہم دعوتی ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے۔

آفسیٹ کی خوبصورت طباعت، عمدہ ٹائٹل، صفحات: ۱۲۸ قیمت =/۴۰ روپے

قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) کے حالات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات، ان کی بداعتقادیوں اور بد اعمالیوں کی تفصیلات اور ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی جانے والی سزاؤں اور تنبیہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اہلِ کتاب کے اس مفصل تذکرہ کا مقصد کیا ہے؟اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت ونصیحت کے کون سے پہلو ہیں؟اور اس سے انہیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟اس کتاب میں ان موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری کا مبسوط مقدّمہ بھی ہے۔

عمدہ کاغذ، آفسیٹ کی حسین طباعت، دیدہ زیب سرورق، صفحات: ۲۹۶ قیمت =/۷۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵